بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ، وَالعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلاةُ وَالسَّلامُ عَلَى سَيِّدِ المُرْسَلِيْنَ رَسُوْلِ رَبِّ العَالَمِيْنَ، سَيِّدِنَا وَمَوْلانَا مُحَمَّدٍ رَحْمَةٍ لِلْعٰلَمِيْنَ، وَعَلَى آلِهِ الطَّاهِرِيْنَ، وَأَصْحَابِهِ الهَادِيْنَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا بِهَدْيِهِ وَاقْتَدَوْا بِآثَارِهِ، فَقَدْ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ العَزِيْزِ الرَّحِيْمِ الحُسْنَى فِيْ كِتَابِهِ المُبِيْنِ، فَهُمْ عَنْ النَّارِ مُبْعَدُوْنَ، لا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا وَهُمْ فِيْمَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُوْنَ، خُصُوْصًا عَلَى الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ المَهْدِيِّيْنَ، الَّذِيْنَ أُمِرْنَا بِاتِّبَاعِ سُنَّتِهِمْ عَاضِّيْنَ عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، جَعَلَنَا اللّٰهُ مِمَّنْ يُطِيْعُهُ وَيَتَّبِعُ الرَّسُوْلَ وَيَقْتَدِيْ بِأَصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ، وَيَحْشُرُنَا فِيْ زُمْرَتِهِ يَوْمَ الدِّيْنِ. (آمِيْنَ).

أمّـا بـعد: بندۂ ظلوم وجہول اہل حق کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ ہمارے زمانے میں مشہور عالم، بزرگ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی شخصیت ایسی نمایاں ہوچکی ہے کہ کسی کتاب کے صحیح ہونے کی ضمانت؛ محض آپ کے نام کا آجانا ہی مان لیا جاتا ہے، مولانا مدظلہ نے اپنی تازہ شاہکار ''المرتضیٰ'' نامی کتاب کو جوں ہی شائع کیا؛ ہر طرف سے اس کی پذیرائی ہونے لگی، جرائد ورسائل میں ہر طرف سے اس کی تعریف میں بیانات آنے لگے، تو شدتِ اشتیاق سے ہم نے از اول تا آخر اس کا مطالعہ اس طرح کیا کہ حوالجات میں سے جتنی کتابیں ہمیں مل سکیں سب کو سامنے رکھ کر پڑھ ڈالا، درحقیقت مضامین بلند پایہ تھے؛ لیکن اصل سے مراجعت کرنے پر معلوم ہوا کہ مختلف روایتوں میں سے جس روایت کو ترجیح دے کر کتاب میں نقل کیا ہے، اس میں بہت جگہ مرجوح روایتیں آگئی ہیں، اس وجہ سے کتاب کے مضامین ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور علم الانساب میں بھی کچھ فروگذاشتیں ہوگئی ہیں، پس ہم نے ان کو مفصل نوٹ کرنے کے بعد اس کی

ایک قسط سب سے پہلے مصنف مدظلہ کے پاس بھیجی اور عرض کیا کہ یہ خامیاں ہماری نظر میں آئیں، اگر قابل رجوع ہوں تو ان باتوں سے رجوع کر کے اس کا اعلان کر دیں؛ تا کہ جس انداز میں کتاب ''المرتضیٰ'' کی اشاعت ہوئی ہے، اسی انداز میں رجوع بھی مشتہر ہو جائے، ورنہ ہمیں مطمئن کر دیں۔

ہم نے مصنف کی شخصیت اور ان کا احترام ملحوظ رکھ کر یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ وسطِ فروری ۱۹۸۹ء کو ہم نے یہ رجسٹری بھیجی تھی؛ مگر ایک ماہ سے زیادہ انتظار کرنے کے بعد جب کوئی جواب نہیں آیا؛ بلکہ ہم کو ایک روایت یہ پہنچی کہ ہماری تنقید میں سے مصنف مدظلہ نے بہت تھوڑا سا پڑھا، پھر ہماری آٹھ ورق تحریر کو پھاڑ کر کوڑے دان میں ڈال دیا واللہ اعلم، تو ہم نے پوری تحریر کا فوٹو لے کر مختلف ماہنامہ کے ذمہ دار حضرات کو بذریعہ رجسٹری بھیج دیا اور ان کو بھی دعوت دی کہ اگر آپ کے نزدیک ہماری گرفت صحیح نہ ہو تو ہم کو مطمئن کر دیں؛ ورنہ اس تنقید کو رسالہ کی قریبی اشاعت میں شائع کر دیں؛ مگر ابھی تک ان رسالوں میں سے کسی میں ہمارا مضمون شائع نہیں ہوا، تو اللہ کا نام لے کر اس کو مستقل کتاب کی شکل میں شائع کر رہے ہیں اور تمام اہل علم سے درخواست کرتے ہیں کہ اس تنقید کو ملاحظہ فرما کر اپنی تصویب یا مدلل تردید سے ہم کو مطلع کریں، دونوں قسم کی تحریروں کو ہم انتہائی قدر دانی اور شکریہ کے ساتھ پڑھیں گے، ان شاء اللہ تعالی۔

کتاب ''المرتضیٰ'' کا سب سے بڑا المیہ وہ ریمارک ہے جو امیر عادل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات پر کیا گیا ہے، واللہ المستعان۔

محتاج دعا

زین العابدین ولد محمد بشیر مرحوم المعروفی الاعظمی

خادم حدیث نبوی ﷺ مدرسہ مظہر العلوم بنارس

مورخہ ۲۲/ شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ مطابق ۲۸/ مئی ۱۹۸۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب ''المرتضیٰ'' پر ایک تحقیقی نظر

نام کتاب: المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ، مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
شائع کردہ: مجلسِ تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، باراول ۱۹۸۸ء
صفحات: ۴۶۴، قیمت ساٹھ روپیہ (اردو ایڈیشن)

کتاب نہایت آب وتاب کے ساتھ عمدہ کاغذ اور جلی وخوشخط کتابت کے ساتھ چھپی ہے، جاذبِ نظر و دیدہ زیب ہونے کے ساتھ سیرتِ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ پر ایک مبسوط کتاب کہی جاسکتی ہے، ناشرین نے اس کے مناقب وفضائل ڈسک کور کے ایک پورے صفحہ پر لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ ''مستند کتبِ تاریخ، ناقابل انکار واقعات وحقائق اور تجزیاتی وتقابلی مطالعہ کی روشنی میں'' یہ کتاب لکھی گئی۔

اس کتاب میں سیرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے مضامین صرف ۳۱۹ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور بقیہ ۱۴۵ صفحات میں دوسرے مضامین اور انڈکس ومسئلہ امامت، واولادِ علی رضی اللہ عنہ کے حالات ہیں، جوتقریباً کتاب کا ایک تہائی حصہ ہے، اس کتاب کے اجرا کے موقع پر پھر بعض رسالوں میں اس کی بہت مدحت سرائی کی گئی ہے؛ لیکن ہمارے نزدیک اس کتاب میں کافی حد تک خامیاں موجود ہیں۔

پہلی خامی

﴿۱﴾ مصنف مدظلہ کی ہر کتاب میں دو خامیاں قدرِ مشترک ہوا کرتی ہیں، جس کی طرف محترم حیات اللہ انصاری صاحب نے عرصہ ہوا توجہ دلائی تھی؛ مگر مصنف نے اس کی طرف توجہ نہیں کیا اور اس کتاب ''المرتضیٰ'' میں ان کا اعادہ کرڈالا، ایک مکررات؛ کہ جو مضامین پہلی تصنیفات میں آچکے ہوتے ہیں، دوسری تصنیف میں مفصل یا مختصر ان کا

اعادہ ضرور ہوتا ہے، چنانچہ اس کتاب میں سابق تصنیفات ''نبی رحمت''، ''مختارات''، ''مَاذَا خَسِرَ العَالَمُ بِانْحِطَاطِ المُسْلِمِیْنَ'' وغیرہ کے مضامین بکثرت آ گئے ہیں اور ایک پورا مضمون جو ۲۹ سال پہلے ''فاران'' کراچی میں چھپ چکا تھا؛ اس کو آخر میں ملحق کر کے کتاب کی ضخامت بڑھا دی گئی ہے، دوسری چیز خاندانی بزرگوں اور خردوں کے مناقب ہر کتاب میں ضرور بڑھائے جاتے ہیں، اگر مضمون مناسب ہوا تو خیر؛ ورنہ مناسبت پیدا کر کے ضرور لکھے جاتے ہیں، جس کو اکابرین امت ''خودستائی'' قرار دیتے ہیں، مرشد رومی فرماتے ہیں ؎

مادح خورشید مداح خوداست ☆☆ کہ دو چشمم روشن و نامرمداست

اس کتاب میں بھی والد محترم مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ رائے بریلوی اور برادر مکرم ڈاکٹر عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ کے اوصاف و کمالات اور اول الذکر کی تصنیفات کا تعارف اچھے ڈھنگ سے کرادیا گیا ہے، والد محترم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''برصغیر کی تاریخ، ثقافت و علم و تمدن پر متعدد اہم کتابوں کے مصنف تھے، مختلف النوع اہم شخصیات اور علما و صوفیا کے حالات میں انھوں نے آٹھ جلدوں میں ایک مبسوط کتاب تصنیف فرمائی ہے (نزہۃ الخواطر)، اور وہ علمی حلقوں میں اس موضوع پر ایک مستند و مفصل ماخذ و مرجع کی حیثیت رکھتی ہے''۔

نزہۃ الخواطر کے بارے میں خوش فہمی

بیشک '' نُـزهَـة الخَواطِر '' میں شخصیات کی طویل فہرست ہے؛ لیکن سیرت علی رضی اللہ عنہ میں اسے ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور علمی حلقوں میں اس کے ''مستند'' ہونے کی خوش فہمی بھی قابل غور ہے، جیسا کہ عصر حاضر میں ''فن رجال'' کی ایک مسلمہ شخصیت نے شیخ تقی مانک پوری کے حالات میں ''نزہۃ الخواطر'' کے بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''چشتی کا بیان قابل ترجیح ہے؛اس لئے کہ ''نزھة الخواطر''کا ماخذ ''مَنبَع الانساب'' ہے، جو بالکل غیر مستند اور بے سروپا بیانات؛ بلکہ جعلی حکایات کا مجموعہ ہے،تعجب ہے کہ مولانا عبدالحی رائے بریلوی رحمہ اللہ نے اس پر کس طرح اعتماد کیا؟

(دست کار اہل شرف ص:۴۰،ازمحدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی)

دوسری خامی

﴿۲﴾ جگہ جگہ اس کتاب ''المرتضیٰ'' میں خودستائی اور تعلّی بھی نظر آئی۔

﴿الف﴾ ''ضرورت ایسی کتاب کی باقی ہے جس میں وسیع پیمانہ پر مختلف گوشوں کا انصاف کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہو، لگے بندھے حدود سے نکل کر جدید تحقیقی اسلوب سے قلم اٹھایا گیا ہو،صرف انھیں مواد ومعلومات پر انحصار نہ رکھا گیا ہو، جو سوانح نگاروں نے اپنی کتابوں میں فراہم کر دیا ہے،مصنف کی ہمت بلند اور نگاہ وسیع ہو''۔(المرتضیٰ ص:۱۸)

گویا اب تک کے مصنفین سوانح نہ انصاف پسند تھے اور نہ وسعتِ نظر رکھتے تھے،جو''المرتضیٰ'' کے مصنف کو حاصل ہے۔

﴿ب﴾ احمد حسن الزیات نے چار شواہد اس بات پر پیش کئے ہیں کہ کتاب ''نہج البلاغۃ'' کا زیادہ تر حصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف جعلی منسوب کیا گیا ہے،اس اقتباس کو مصنف ''المرتضیٰ'' یوں نقل کرتے ہیں:

''کچھ لوگوں کا رجحان اس طرف ہے کہ اس کا بڑا حصہ ''الشریف الرضی'' کی تصنیف ہے؛ کیوں کہ (۱) اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طنز وتعریض ہے اور ان کے حق میں نامناسب الفاظ آ گئے ہیں۔ (۲) اور اس لئے بھی کہ اس میں فلسفۂ اخلاق اور علم الاجتماع کی ایسی باتیں بھی ہیں جو بعد کی پیداوار ہیں۔ (۳) اور بہت باریکی کے ساتھ کسی چیز کا وصف اور صنائع بدائع کا تکلف پایا جاتا ہے، جو اس زمانے کی چیز نہیں تھی۔ (۴) اور وہ اس زمانے کے لوگوں کے مزاج سے مناسبت نہیں

رکھتا، ظاہر ہے کہ اس مجموعہ میں بہت کچھ علی کا کلام ہے اور زیادہ تر حصہ ان سے منسوب کیا گیا ہے''۔

اس کے بعد مصنف اپنی تعریف اپنے قلم سے یوں تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن ایک صاحبِ بصیرت ناقد جس کو اس عصر کی زبان و اسلوب سے واقفیت اور اس کا ذوق ہے؛ وہ جانتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو استثنائی طور پر کیا وہبی صلاحیتیں اللہ نے عطا کی تھیں اور انسانی نفوس کے کیا تجربات ان کو حاصل تھے، زندگی کے سرد و گرم کا انھیں کس درجہ تجربہ تھا، جس کو یہ معلوم ہے وہ بہ آسانی تمیز کرسکتا ہے کہ کون سا کلام ان کے شایانِ شان ہے اور کون سا نہیں اور ان باتوں کو بہ آسانی تمیز کرسکتا ہے جو ان کی جانب منسوب ہیں''۔ (المرتضیٰ ص:۲۸۸-۲۸۷)

اس ادعائی تعلّی سے بھی ''الزیات'' کی بات رد نہیں ہوتی؛ کیوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طنز و تعریض والی وجہ کا جواب نہیں ہوا، اور جن کے سامنے وہ خطبے دیئے گئے انھیں تو استثنائی طور سے وہ وہبی صلاحیتیں نہیں عطا ہوئی تھیں کہ اتنی باریکی کو اور علم الاخلاق اور علم الاجتماع کی بعد والی پیداواروں کو سمجھتے اور انہیں کے سامنے یہ خطبے دیئے گئے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے فصیح و بلیغ، قادر الکلام کی طرف منسوب ہیں؛ حالاں کہ کسی کلام کے فصیح و بلیغ ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ مقتضیٰ حال کے مطابق ہو۔ (تلخیص المفتاح)، غرض نمبر۳ و۲ کا جواب مان بھی لیں تو نمبر ۱ اور نمبر ۴ کا جواب اب بھی نہیں ہوا۔

تاریخی غلطیاں

﴿۳﴾ بہت سی جگہوں میں تاریخی غلطیاں اور مختلف صفحات میں تضاد بیانی بھی پائی جاتی ہے، جیسے:

﴿الف﴾ ''ابن سیرین اور علامہ مقبلی سے ''العلم الشامخ'' میں روایت نقل کی گئی ہے: نہج البلاغہ میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کی اصلیت میں شک ہے''۔

(المرتضیٰ ص:۲۸۷)

محمد بن سیرین کی وفات ۱۱۰ھ میں ہو چکی ہے، ان کی وفات کے دوسوانچاس برس کے بعد ''نہج البلاغہ'' کے مصنف ۳۵۹ھ میں پیدا ہوئے، اگر پندرہ سال کی عمر میں ان خطبات امیر المومنین کو ''نہج البلاغہ'' میں جمع کئے ہوں تو ابن سیرین کی وفات کو دوسوانسٹھ برس ہو گئے، پھر کس طرح ابن سیرین نے ''نہج البلاغہ'' پر نقد کیا؟

اور اگر یہ کوئی دوسرے ابن سیرین ہوں، تو مصنف محقق کو تعیین کرنی ضروری تھی؛ کیوں کہ محققین فرما گئے ہیں کہ: ''إذَا أُطْلِقَ ابنُ سِيرِيْنَ فَهُوَ مُحَمَّدٌ هَذَا''، جب بلا قید ابن سیرین کہا جائے، تو یہی محمد بن سیرین مراد ہوتے ہیں۔

چوتھی خامی تضاد بیانی

﴿۴﴾ ''لگے بندھے حدود سے نکل کر جدید تحقیقی اسلوب میں'' عرق ریزی کی بنیاد پر تضاد بیانی ملاحظہ ہو:

سب سے پہلے کون سے صحابی اسلام لائے، علما کا اس میں اختلاف ہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، صحابہ اور تابعین کے زمانے میں مختلف فیہ رہا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلام لائے، اس کو زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت ہے؛ لیکن عمرو بن عنبسہ، حسان بن ثابت اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسلام لائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی تصدیق کی ہے۔

اس اختلاف کے پیش نظر محققین علما حضرت امام ابوحنیفہ اور امام نووی رحمہما اللہ نے ورع اور احتیاط کا پہلو اختیار کیا، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قَدْ اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِيْ أَوَّلِ مَنْ أَسْلَمَ، فَقِيْلَ: خَدِيْجَةُ، وَقِيْلَ: أبُو بَكْرٍ، وَ قِيْلَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ، وَالصَّحِيْحُ خَدِيْجَةُ ثُمَّ أبُوْبَكْرٍ ثُمَّ عَلِيٌّ

.... قَالَ الْعُلَمَاءُ: الْأَوْرَعُ أَنْ يُقَالَ: أَوَّلُ مَنْ أَسْلَمَ مِنَ الرِّجَالِ الْأَحْرَارِ أَبُوْ بَكْرٍ، وَمِنَ الصِّبْيَانِ عَلِيٌّ، وَمِنَ النِّسَاءِ خَدِيْجَةُ.

سب سے پہلے کون سے صحابی اسلام لائے، علما کا اس میں اختلاف ہے، حضرت خدیجہ، حضرت ابوبکر، حضرت علی رضی اللہ عنہم ؛ تینوں کے بارے میں اقوال ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت خدیجہ پھر حضرت ابوبکر پھر حضرت علی رضی اللہ عنہم، اور علما نے فرمایا کہ زیادہ احتیاط اور پرہیز گاری کی بات یہ ہے کہ کہا جائے: آزاد مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر اور بچوں میں سب سے پہلے حضرت علی اور عورتوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہم اسلام لائیں۔ (تہذیب الاسماء واللغات)

لیکن جدید تحقیق میں احتیاط و پرہیز گاری کی لگی بندھی حد کو توڑ کر اصرار ہے کہ سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علی الاطلاق اسلام لانے والا قرار دو؛ کیوں کہ یہ فطری بات ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت میں تھے تو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو انہی نے قبول کیا ہوگا۔ یعنی محققین کو یہ فطری بات سمجھ میں نہیں آئی ہوگی۔ عرض ہے کہ پھر تو خواجہ ابوطالب جو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناز برداری اور مدد کرتے رہے ان کے اسلام نہ لانے کی روایت بھی قابل قبول نہیں ہوگی؛ کیوں کہ یہ فطری بات کے خلاف ہے؟

پھر لکھتے ہیں:

> ”بعض محققین نے اور مختلف روایات کو یکجا کرنے والے علما نے اس طرح جمع کیا ہے کہ اہل بیت وخواتین میں سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تھیں، پختہ کار اور پختہ عمر لوگوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور کم عمر والوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے؛ لیکن پہلی بات زیادہ قرین قیاس ہے“۔
> (المرتضیٰ ص:۵۲)

محققین کوتو قرینہ قیاس نہیں معلوم ہوا؛لیکن مصنف ''المرتضیٰ'' کوتو معلوم تھا، پھر اسی کتاب ''المرتضیٰ'' کے صفحہ نمبر ۱۶۱ پر یہ معارض بات کیسے لکھی:

''روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی ؛حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ''إِنَّا لِلَّـهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ'' پڑھا اور روتے ہوئے عجلت کے ساتھ وہاں پہنچے اور کہا:

''اللہ کی آپ پر رحمتیں ہوں اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! واللہ! آپ سب سے پہلے اسلام لائے اور سب سے زیادہ آپ کا ایمان مکمل تھا اور سب سے زیادہ آپ کا یقین پختہ تھا۔ (الی آخر الخطبہ)''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ تو قسم کھا کر فرمائیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلام لائے ؛مگر ''دودۂ علی رضی اللہ عنہ'' یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ پختہ کار پختہ عمر لوگوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

دوسری تضاد بیانی

﴿۵﴾ اس کتاب کا وسیع پیمانے پر انصاف کے ساتھ جائزہ لینے پر ایک اور تضاد بیانی کا پتہ چلا۔

''صحیح روایتوں کے بموجب سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بعثتِ نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے''۔ (المرتضیٰ ص:۴۸)

اگر یہ روایت صحیح ہے تو غزوۂ بدر کے موقعہ پر (رمضان ۲ھ میں) آپ رضی اللہ عنہ کی عمر شریف پچیس سال ہوتی ہے: ۱۰+۱۳+۲ = ۲۵، اس غزوہ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے نمایاں جنگی کردار سیرت وحدیث کی بہت سی کتابوں میں ہیں، مصنف نے بھی ''المرتضیٰ'' میں اس سے پہلے کا کوئی جنگی کارنامہ ذکر نہیں کیا، پھر ۳۹ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ دیا ہے، اس خطبے کے ان الفاظ پر غور کیجئے:

''خدا گواہ ہے، میں جنگ میں اس وقت آیا ہوں جب میری عمر بیس سال سے

کم تھی اور آج ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہو چکی ہے''۔ (المرتضیٰ ص:۲۷۹)

اوپر والی صحیح روایت کے مطابق غزوۂ بدر سے چھ سال پہلے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر بیس سال سے کم تھی؛ اس وقت یعنی نبوت کے نویں سال کون سی جنگ ہوئی تھی، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ میں آئے ہیں؟ اور حال یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے قتال کا حکم ہی نہیں آیا تھا، پس اگر غزوۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر بیس سال سے کم تھی تو آپ رضی اللہ عنہ کی پیدائش بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ۴-۵ سال پہلے ماننی پڑے گی؛ اس لئے المرتضیٰ ص: ۴۸ اور ص:۲۷۹ میں سے کسی ایک کو صحیح مانیں تو دوسرے کو بالضرور غلط ماننا پڑے گا اور لطف یہ ہے کہ ص: ۲۷۹ کی عبارت مستند ادبی مجموعہ ''الکامل'' از المبرد سے نقل کی گئی ہے اور ''صاحب بصیرت ناقد نے آسانی سے تمییز کرلیا ہے کہ واقعی یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کلام ہوسکتا ہے''۔ (دیکھو ''المرتضیٰ'' ص:۲۸۸)۔

ہمارے نزدیک ان متضاد بیانات کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نقلوں کے مستند ہونے کا ذریعہ صرف صحیح اور متصل اسانید ہوتی ہیں، ان سے مصنف نے صرف نظر کر کے صرف اپنی ناقدانہ بصیرت اور اس عصر کی زبان اور اپنے ذوق سلیم پر اعتماد کرلیا ہے؛ حالاں کہ ذوق اور ناقدانہ بصیرت کا مرتبہ اسانید کے بعد آتا ہے، غور کیجئے کہ رمضان ۴۰ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور مصنف ''نہج البلاغہ'' الشریف الرضی نے ۴۰۴ھ میں وفات پائی، اب سے تین سو چونسٹھ برس پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو خطبے دیئے ان کو الرضی نے کن اسانید سے معلوم کیا؟ کاش مصنف اس کی جستجو کئے ہوتے اور صرف اس خودستائی مبتلا نہ ہوئے ہوتے کہ میں عصر اول کے زبان واسلوب کا ذوق سلیم رکھتا ہوں؛ اس لئے میرا ذوق جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام تسلیم کرے وہ ضرور ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام ہوگا۔ مزید یہ کہو کہ دوسرے مستند ادبی ذخیروں میں بھی وہ کلام پایا جاتا ہے۔

تضاد بیانی کی تیسری مثال

﴿۶﴾ تضاد بیانی کی ایک اور مثال: حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اوصاف وکمالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خلافت کی پوری مدت کو ایک مسلسل مجاہدہ، ایک مسلسل کشمکش، ایک مسلسل سفر میں گزارنا؛ لیکن نہ تھکنا، نہ مایوس ہونا، نہ شکایت، نہ راحت کی طلب، نہ محنت کا شکوہ، نہ دوستوں کا گلہ، نہ دشمنوں کی بدگوئی وغیرہ وغیرہ'' (ص:۴۲۹ ''المرتضیٰ'')۔

اس کے بالمقابل دوستوں کا گلہ اور شکوہ شکایت ملاحظہ کیجئے:

عراقی فوج کی فہمائش میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان اقوال کو ملاحظہ کیجئے:

''اے مردنما لوگو! جن میں مردانگی نام کو نہیں، اے خواب وخیال کی پرچھائیوں! اے پازیب پہننے والیوں کی جیسی عقل رکھنے والو! بخدا ! تم نے اپنی نافرمانیوں سے میری سیاست پر پانی پھیر دیا، غم وغصہ سے مجھے بھر دیا، بات یہاں تک پہنچ گئی کہ قریش کہتے ہیں کہ ابوطالب کا فرزند ہے تو بہادر؛ مگر جنگ کی حکمت نہیں جانتا''۔ (المرتضیٰ ص:۲۷۹)۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''(عراق کے امیر علی بن ابی طالب اس عصر میں) سب سے زیادہ علم وفضل کے حامل، سب سے زیادہ خوف خدا رکھنے والے انسان تھے، پھر بھی لوگوں نے ان کو بے یارومددگار چھوڑ دیا، ان سے کنارہ کش ہوگئے، یہاں تک کہ خود امیر المؤمنین اپنی زندگی سے اکتا گئے اور موت کی تمنا کرنے لگے''۔ (المرتضیٰ ص:۲۸۰)

پہلے پیرا میں ''زبان ہوش مند'' نے جن باتوں کا انکار کیا تھا، پیرا نمبر ۲ و ۳ میں ان سب باتوں کا ثبوت پیش کر دیا۔

تضاد بیانی کی چوتھی مثال

﴿۷﴾ المرتضیٰ ص:۲۳۹ کی یہ عبارت پڑھئے:

''ان حالات میں قصاص کے مطالبہ کی آواز اٹھتی ہے اور ایسے حلقہ سے اٹھتی ہے جہاں حادثہ کے زمانہ میں کسی نے اس خون ناحق کے خلاف انگلی بھی نہیں ہلائی تھی''۔

پھر اس عبارت کو پڑھیے:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: تو پھر ایسا ہوسکتا ہے کہ ملک شام سے ایک فوج بھیج دوں، جو مدینہ میں آپ کی حفاظت کے لئے رہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا .... (المرتضیٰ ص:۲۳۰)

اب بتائیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جو قصاص کا مطالبہ کررہے تھے، ان کو کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ خون ناحق کے خلاف انگلی بھی نہیں ہلائی تھی، یہ دونوں عبارتیں متضاد بیانات ہیں، یا نہیں؟

آٹھویں خامی

﴿۸﴾ ایک خامی یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ پہلے ایک نظریہ متعین کرلیا گیا ہے، اب اگر کوئی ضعیف سے ضعیف تر روایت اس نظریہ کے مطابق مل گئی، تو اس کو قرینۂ قیاس ؛ بلکہ قیاس مع الفارق کی ''جدید تحقیق'' میں امر واقعی اور حقیقت بتادیا گیا ہے۔ اور اگر اس نظریہ کے خلاف قوی، مضبوط ؛ بلکہ متفق علیہ روایت بھی موجود ہو، تو بات کا بتنگڑ بنا کر صحیح روایت کو رد کرنے ؛ بلکہ اپنے مزعومہ پر تائیدی طور سے پیش کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھا گیا، جب کہ وہ روایت قطعی طور سے اس مزعومہ کی نفی کرتی ہے۔

مثال کے طور پر درِ خیبر اکھاڑنے کی داستان، ''جس دروازے کو چالیس آدمی ہلا نہیں سکے؛ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور صحابۂ کرام قلعہ کے

اندر داخل ہوگئے''، انتہائی ضعیف روایت ہے اور اس کے ضعف کو مصنف نے حاشیہ کتاب ''المرتضیٰ'' میں تسلیم بھی کیا ہے؛ مگر مصنف ابن ابی شیبہ (یا بقول مصنف: مسند ابن شیبہ) کے واسطہ سے کنز العمال میں مل گئی، تو اس کو اس طمطراق کے ساتھ ''المرتضیٰ'' ص:۸۰ میں نقل کردیتے ہیں۔

''مسند ابن شیبہ میں انھوں نے اپنی سند سے لیث سے روایت کی ہے کہ ہم جعفر (صادق) کے پاس گئے، ان پر خشیت وندامت کی کیفیت طاری تھی، وہ روئے اور اس کے بعد کہا:

''مجھ سے جابر نے روایت کی کہ علی رضی اللہ عنہ نے خیبر کے دن قلعہ کا دروازہ اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا تھا، جس کی بنا پر مسلمان خیبر کے قلعہ پر چڑھ گئے اور اس کو فتح کرلیا، یہ پھاٹک اتنا بھاری تھا کہ کوشش کرکے دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ چالیس آدمیوں سے کم اس کو اٹھا نہیں سکتے''۔ (کنز العمال بہ رمز ''ش'')

پھر حاشیہ میں ''جدید تحقیقی اسلوب سے'' اس داستان کو اس طرح باور کرانے کی کوشش کررہے ہیں: ابن کثیر نے اس کو اور جعفر کی ایک دوسری روایت کو ضعیف قرار دیا ہے؛ لیکن یہ روایت مختلف طریقوں سے مروی ہے اور یہ مشہور واقعہ ہے اور اس کا واقع ہونا مستبعد نہیں ہے، پھر عقائد کا ایک مسئلہ لکھتے ہیں: اولیاء اللہ سے کرامت کا صدور برحق ہے اور حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ تو اولیائے امت کے سرگروہ ہیں''۔

گویا سرگروہِ اولیاء علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی ضعیف یا غیر واقعی بات کو مشہور کردیا جائے تو اس کو بھی کرامت سمجھ کر یقین کرلینا چاہیے۔

لکھنؤ کے ایک خاص ''طبقہ'' میں یہ کرامت بھی مشہور ہے کہ مرحب یا عنتر پر حیدر کرار نے تلوار چلائی تو اس کی خود کٹی، پھر سر دو پھانک جبڑے سمیت ہوگیا اور زور حیدر سے اس کا سارا جسم دو پھانک ہوگیا، تلوار زمین پر پہنچنے سے پہلے حضرت جبرئیل امین آکر اگر حملۂ حیدری کو اپنے بازوؤں پر نہ روکتے تو سات طبق زمین کٹ جاتی، پھر

بھی جبرئیل امین کے کئی پر کٹ گئے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ ۔

تو کہئے کرامت کے طور پر ہوسکتا ہے اور یہ عقائد کے خلاف بھی نہیں؛ اس لئے اس کو بھی باور کر لیجئے۔ ''ہوسکتا ہے'' اور ''ہوگیا ہے'' میں کچھ فرق ہے؟

اب درِ خیبر اکھاڑنے والی روایت کی حیثیت ملاحظہ ہو:

درِ خیبر اکھاڑنے والی داستان کی حقیقت

جعفر صادق علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ مجھ سے جابر نے روایت بیان کی کہ علی رضی اللہ عنہ نے خیبر کے دن یوں یوں کیا۔

تو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ عمل کر رہے تھے، تو جابر رضی اللہ عنہ دیکھ رہے ہوں گے، عام مسلمان تو یہی سمجھیں گے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں، وہی حضرت جعفر صادق سے بیان کر رہے ہیں۔ (بلکہ خدام ادب بھی جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ہی سمجھ رہے ہیں، جیسا کہ کتاب ''المرتضیٰ'' کی ضخامت بڑھانے کی خاطر جس خادم خاص نے اس کتاب کا انڈکس تیار کیا ہے، انھوں نے ''جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما'' صراحتاً لکھا ہے۔ (انڈکس ص: ۴۳۷)

تو سنئے! حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی وفات ۷۸ھ میں ہوئی، اس کے دو سال بعد ۸۰ھ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ الرحمۃ پیدا ہوئے، تو پیدائش سے پہلے حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے امام موصوف نے ملاقات کر کے یہ واقعہ سن لیا تھا؟ ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ اولیائے امت سے کرامت کا صدور برحق ہے؟

اور اگر یہ کوئی دوسرے جابر ہوں، جن سے جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے دنیوی زندگی میں ملاقات کر کے یہ روایت لی ہو، تو وہ واقعہ کے عینی شاہد نہیں۔

اور اگر یہ جابر؛ جابر بن یزید جعفی شیعی راوی ہوں، تو وہ بھی یہ نہیں بتاتے کہ مجھ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ بیان کیا؛ بلکہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

نے یوں کیا، تو کیا جابر اس کو دیکھ رہے تھے؟

میرا گمان ہے کہ داستان گھڑنے والے یہی جابر جعفی ہوں گے، (مصنف کی جو بھی تحقیق ہو) تو ان صاحب کو سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، مسعر بن کدام، جراح بن الملیح وغیرہ بہت سے لوگوں نے مطعون بتایا ہے، سفیان اور زہیر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جابر کی تیس ہزار؛ بلکہ بقول جابر "پچاس ہزار" حدیثوں میں سے کسی ایک حدیث کا بیان کرنا حلال ہی نہیں۔ (دیکھو مقدمہ صحیح مسلم)

مگر جدید تحقیقی اسلوب نے کیا گل کھلایا۔ اور لگے بندھے حدود سے نکل جانے کے بعد کیسا صاف راستہ سجھائی دیا کہ جو چیز اکابرین امت کے نزدیک حلال نہیں تھی؛ اس کو کرامت کے طور پر امت کو پلایا جا رہا ہے، پھر ابن شیبہ کی سند کا کیا حال ہے؟ اور لیث کون ہیں؟ ابن سعد؟ یا ابن ابی سلیم؟ کچھ پتہ نہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

یعنی مصنف کے مزعومہ کے خلاف صحیح، متفق علیہ حدیث موجود ہو، تو اس میں چابک دستی کی مثال:

باب: ۳: حضرت علی رضی اللہ عنہ دورِ صدیقی میں:

"مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ضروری سمجھا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے احساسات و جذبات کا کسی درجہ لحاظ کریں؛ اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی، پھر جب فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بر سرِ عام بیعت کی"۔ (المرتضیٰ ص:۱۵۱)

اس واقعہ کے مشہور ہونے کا اعتراف تو مصنف کر ہی رہے ہیں، اب اس حدیث کے صحیح ہونے کا ملاحظہ فرمائیے:

یہ حدیث صحیح بخاری باب غزوۃ خیبر ص:۶۰۹ طبع ہندی میں بہت مفصل ہے اور

مختصراً چار جگہوں میں اور بھی مذکور ہے اور مسلم بَـابُ حُـكم الفَئ ص:۹۲ ج:۲ طبع ہندی میں بھی ہے، یہ متفق علیہ حدیث ہے، یہاں کی ضرورت کے مطابق عبارتِ ذیل دیکھئے:

وَعَـاشَـتْ (فَـاطِـمَةُ) بَـعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةَ أَشْهُرٍ، فَلَمَّا تُوُفِّيَتْ دَفَنَهَا زَوْجُهَا عَلِيٌّ لَيْلاً وَلَمْ يُؤْذِنْ بِهَا أَبَا بَكْرٍ وَصَلَّى عَلَيْهَا، وَكَانَ لِعَلِيٍّ رَضِـيَ اللّٰـهُ عَنْهُ مِنَ النَّاسِ وَجْهٌ حَيَاةَ فَاطِمَةَ، فَلَمَّا تُوُفِّيَتْ اسْتَنْكَرَ عَلِيٌّ وُجُوهَ النَّـاسِ، فَـالْتَمَسَ مُصَالَحَةَ أَبِيْ بَكْرٍ وَمُبَايَعَتَهُ، وَلَمْ يَكُن يُبَايِعُ تِلْكَ الأشْهُرَ، فَـأَرْسَـلَ إِلَـى أَبِـيْ بَـكْرٍ أَنْ ائْتِنا، وَلا يَأْتِنَا أَحَدٌ مَعَكَ، كَرَاهِيَةً لِيَحْضُرَ عُمَرُ، فَـقَـالَ عُـمَرُ: لا وَاللّٰهِ! لا تَدْخُلُ عَلَيْهِمْ وَحْدَكَ، فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ: وَمَا عَسَيْتَهُمْ أَنْ يَفْعَلُوْهُ بِيْ، وَاللّٰهِ! لآتِيَنَّهُمْ، فَدَخَلَ عَلَيْهِمْ أَبُوْ بَكْرٍ، فَتَشَهَّدَ عَلِيٌّ فَقَالَ: إِنَّا قَدْ عَرَفْنَا فَضْلَكَ، وَمَا أَعْطَاكَ اللّٰهُ، وَلَمْ نَنْفَسْ عَلَيْكَ خَيْرًا سَاقَهُ اللّٰهُ إِلَيْكَ، وَلَـكِـنَّكَ اسْتَبْـدَدْتَ عَـلَيْـنَـا بِالأَمْرِ، (إِلَى أَنْ قَالَ:) فَلَمَّا تَكَلَّمَ أَبُوْ بَكْرٍ قَالَ: وَالَّـذِيْ نَـفْسِـيْ بِيَـدِهِ! لَـقَـرَابَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ أَصِـلَ مِنْ قَرَابَتِيْ .... فَقَالَ عَلِيٌّ لأَبِيْ بَكْرٍ: مَوْعِدُكَ الْعَشِيَّةَ لِلْبَيْعَةِ، فَلَمَّا صَـلَّى أَبُوْبَكْرٍ الظُّهْرَ رَقِيَ المِنْبَرَ، فَتَشَهَّدَ وَذَكَرَ شَأنَ عَلِيٍّ وَتَخَلُّفَهُ عَنِ الْبَيْعَةِ، وَعُذْرَهُ بِالَّذِيْ اعْتَذَرَ إِلَيْهِ، ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ.

(حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ مہینے بعد تک زندہ رہیں، جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے شوہر علی رضی اللہ عنہ نے رات میں دفن کر دیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر نہیں دی، خود ہی ان کی نماز جنازہ پڑھا دی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگانی تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں میں خاص وجاہت حاصل تھی، ان کے وصال کے بعد لوگوں کو نامانوس محسوس کیا، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے صلح کرنے اور بیعت کر لینے کے طالب ہوئے، جب کہ اتنے مہینوں تک بیعت نہیں کئے ہوئے تھے، تو حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر بلا بھیجا کہ آپ ہمارے پاس اکیلے آئیے، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آنے کو ناپسند کرنے کی وجہ سے، تو عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ واللہ! آپ ان لوگوں کے پاس اکیلے نہ جائیے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم ان لوگوں کو کیا سمجھتے ہو؟ ہمارے ساتھ کوئی خراب کام کریں گے؟ میں تو خدا کی قسم اکیلے ہی جاؤں گا، چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے پاس (اکیلے) گئے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد فرمایا: یہ امر واقعہ ہے کہ ہم آپ کی فضیلت کو اور اس نعمت کو پہچانتے ہیں جسے اللہ نے آپ کو دیا اور اس بھلائی میں آپ پر حسد نہیں کرتے جو خدا نے آپ تک پہنچا دیا؛ لیکن آپ نے یہ معاملہ ہمارے بغیر اکیلے طے کرلیا۔ (اور بھی کچھ کہا جس کو ہم نے چھوڑ دیا) پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بولے تو فرمایا: میرے جان کے مالک کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کو جوڑنا مجھ کو اپنی قرابت کے جوڑنے سے زیادہ محبوب ہے......................، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ شام کو آپ سے بیعت کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ظہر کی نماز پڑھی، تو خطبہ دینے منبر پر چڑھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان بیان کی اور بیعت سے ان کے پیچھے رہ جانے کو بتایا اور ان کے اس عذر کو بتایا جو انھوں نے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بتایا تھا، پھر استغفار پڑھ کر نیچے اتر آئے۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور بیعت کرلی۔

دوسری حدیث بخاری ص:۱۰۱۰ پر ہے، اس کو حافظ ابن کثیر نے مسند احمد کی سند سے طویل حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول یوں نقل کیا ہے:

لا يَغْتَرَّنَّ امْرُءٌ أنْ يَقُولَ: إنَّ بَيْعَةَ أبِيْ بَكْرٍ كَانَتْ فَلْتَةً فَتَمَّتْ، ألا وَإنَّهَا كَانَتْ كَذٰلِكَ، إلَّا أنَّ اللّٰهَ وَقَى شَرَّهَا، وَلَيْسَ فِيْكُمُ الْيَوْمَ مَنْ تُقْطَعُ إلَيْهِ الأعْنَاقُ مِثْلَ أبِيْ بَكْرٍ، وَإنَّهٗ كَانَ مِنْ خَبَرِنَا حِيْنَ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أنَّ عَلِيًّا وَالزُّبَيْرَ وَمَنْ كَانَ مَعَهُمَا تَخَلَّفُوْا فِيْ بَيْتِ فَاطِمَةَ

بِـنْـتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَتَخَلَّفَ عَنْهَا الأَنْصَارُ بِأَجْمَعِهَا فِيْ سَقِيْفَةِ بَنِيْ سَاعِدَةَ، إلخ.

کوئی آدمی اس دھوکے میں نہ رہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک ہوگئی تھی، پھر تام ہوگئی، ہاں! وہ بیعت ایسی ہی تھی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی برائی سے بچالیا اور آج تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کی طرف ابوبکر کی طرح لوگوں کی گردنیں اٹھیں، جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اس وقت کی ہماری خبر یہ تھی کہ حضرت علی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہما اور ان دونوں کے ساتھی؛ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں الگ ہو بیٹھے اور انصار کل کے کل سقیفہ بنی ساعدہ میں الگ ہو بیٹھے۔
(البدایہ والنہایہ ج:۵ ص:۲۴۶)

ان دونوں روایتوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیعت سے پیچھے رہ جانے کا بیان ہے اور پہلی متفق علیہ روایت میں چھ ماہ تک پیچھے رہ جانے کی دوجگہ صراحت ہے؛ مگر مصنف کے مزعومہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اپنے مزعومہ کی تائید کرنے والی روایت کو پہلے ''البِـدَايَة و النِّهَـايَة'' سے نقل کیا، جو صحیحین کے درجہ کی ہرگز نہیں، پھر اس مخالف روایت کو جو صحیح متفق علیہ ہے؛ ان الفاظ سے نقل کیا جو اس پیرا کے شروع میں ہم نے ''المُرتَضٰى'' ص:۱۵۱ سے نقل کیا ہے، اس کے بعد اگر لکھتے کہ یہ روایت صحیحین میں مذکور ہے، تو نئی تحقیق نہ بنتی؛ اس لئے اس مقام پر:

> ''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برسرِ عام بیعت کی''۔

لکھنے کے بعد یوں لکھتے ہیں:

> ''ابن کثیر اور دوسرے اہل علم کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ دوسری بیعت پہلی بیعت کی توثیق وتجدید تھی''۔

اس کے بعد یوں لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ میں صحیحین اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں متعدد روایتیں ہیں''۔

تاکہ سرسری طور سے یہ سمجھا جائے کہ صحیحین اور دوسری کتابوں میں بھی حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے رجحان کی تائید موجود ہے؛ حالاں کہ صحیحین میں صرف اسی بیعت کا ذکر ہے، وہ بھی چھ ماہ تخلف اور عذر ومعذرت کے بعد؛ جو مصنف کے مزعومہ کی تردید کرتی ہے۔

اور ''سلسلہ'' کا لفظ صرف اس بچت کے لئے ہے کہ وقتِ ضرورت کام آئے کہ یہ لفظ موافقت، مخالفت دونوں موقع پر بولا جاتا ہے، ورنہ اندازِ تحریر تو صاف صاف مصنف کی تائید ہی کر رہا ہے، غرض واقعہ تخلف کا نہ مشہور ہونا مرجح ہوا اور نہ حدیث متفق علیہ میں اس کا آنا مرجح ہوا اور ''داستان درخیبر'' ضعیف سے ضعیف ہی کیوں نہ ہو؛ مشہور ہونے اور ''كَـرَامَـاتُ الأَوْلِيَـاءِ حَقٌّ'' کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول ٹھہری۔

سیرت نگاروں پر ایک الزام اور خود اس کا مرتکب ہونا

﴿۹﴾ (الف) مصنف مدظلہ نے پچھلے مورخین اور سیرت نگاروں کو ایک الزام یہ دیا ہے:

''چند مبالغہ آمیز داستانیں'' ان کے بارے میں علم وآگہی کا سرمایہ اور سدرۃ المنتہیٰ ہوتا ہے اور اسی چوکھٹہ میں ان کی شخصیت کو (اصحاب سیرت کو) محصور کردیا جاتا ہے......................اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مخصوص عقائد کے حاملین ان کی شخصیت پر اجارہ داری قائم کرلیتے ہیں اور ان کے گرد جذبات وتصورات کا حصار قائم کردیتے ہیں۔ (المرتضیٰ ص:۱۲)

لیکن اس تازہ تصنیف کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اس ''اجارہ داری'' میں خود مصنف بھی شریک ہیں اور آپ کے جذبات وتصورات یہ ہیں کہ جتنے اعلیٰ کارنامے

ہوں وہ سب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے لئے مخصوص ہوجائیں اور دوسرا کوئی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کارناموں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا شریک وسہیم نہ ہو، اس کی چند مثالیں لکھتا ہوں:

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جنگی کارنامہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا

غزوۂ بدر میں مبارزت کا واقعہ پیش آیا، جس میں قریش کا مشہور سپہ سالار عتبہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے اور ولید بن عتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابل ہوا، وہ دونوں مارے گئے؛ لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو زخمی کردیا، تو حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما نے مل کر شیبہ کو موت کے گھاٹ اتاردیا۔

(سیرت النبی ج:۱، ص:۳۲۳، طبع:۵)

مگر مصنف نے اس روایت سے صرف نظر کرکے اس واقعہ کو سیرت ابن ہشام کے حوالے سے یوں نقل کیا:

''عبیدہ رضی اللہ عنہ نے جو عمر میں سب سے بڑے تھے؛ عتبہ کو، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید بن عتبہ کو للکارا، حضرت حمزہ اور علی رضی اللہ عنہما نے اپنے مقابل کے سورماؤں کا پہلے ہی وار میں کام تمام کردیا اور دوبارہ لوٹ کر ان دونوں نے عتبہ کو نمٹایا''۔ (المرتضیٰ ص:۷۱)

مصنف نے اس روایت کو محض اس لئے ترجیح دی ہے کہ ''عتبہ مشہور سپہ سالار کے قتل میں شرکت'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جنگی کارنامہ دکھلانا مقصود ہے، ورنہ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ روایت ''سیرت النبیؐ'' کی روایت کے ہم پایہ نہیں، سپہ سالار کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے تنہا قتل کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیبہ اور ولید میں سے ایک کو تنہا اور دوسرے کو بشرکت حمزہ رضی اللہ عنہ جہنم رسید کیا اور یہ خود ہی ایک عظیم کارنامہ ہے،

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے کارنامے کو سلب کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی اور یہ واقعہ صحیح ہونے کے ساتھ ''مشہور'' بھی ہے، ''شاہنامہ اسلام'' میں حفیظ جالندھری نے خوب بسط سے لکھا ہے اور مصنف کے ''معمول اور ذوق'' کا احترام کرتے ہوئے عربی زبان کی ایک مستند کتاب کی عبارت بھی ہم لکھ دیتے ہیں:

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: تَقَدَّمَ - يَعْنِيْ - عُتْبَةُ بْنُ رَبِيْعَةَ وَتَبِعَهُ ابْنُهُ وَأَخُوْهُ فَنَادَى: مَنْ يُبَارِزُ؟ .... فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قُمْ يَا حَمْزَةُ! قُمْ يَا عَلِيُّ! قُمْ يَا عُبَيْدَةَ بْنَ الحَارِثِ! فَأَقْبَلَ حَمْزَةُ إِلَى عُتْبَةَ وَأَقْبَلْتُ إِلَى شَيْبَةَ، وَاخْتُلِفَ بَيْنَ عُبَيْدَةَ وَالوَلِيْدِ ضَرْبَتَانِ، فَأَثْخَنَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا صَاحِبَهُ، ثُمَّ مِلْنَا عَلَى الوَلِيْدِ فَقَتَلْنَاهُ. (سنن أبي داود/ باب المبارزة من كتاب الجهاد)

اس واقعہ میں مصنف نے ابن ہشام کی روایت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جنگی کارنامہ دکھلا دیا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا غزوۂ بدر میں جنگی کردار حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب

اس کے آگے ابن ہشام کی روایت مصنف کے جذبات سے جب ٹکرا گئی، تو صفائی سے سیرت ابن ہشام کو چھوڑ کر ابن سعد کی ''الطَّبقات'' کا سہارا لیا اور ایک منقطع اثر تلاش کر لیا، جس کی تفصیل یہ ہے:

ابن ہشام لکھتے ہیں:

وَدَفَعَ اللِّوَاءَ إِلٰى مُصْعَبِ بْنِ عُمَيْرِ بْنِ هَاشِمِ بْنِ عَبْدِ مَنَافِ بْنِ عَبْدِ الدَّارِ، قَالَ ابْنُ هِشَامٍ: وَكَانَ أَبْيَضَ.

(جنگ بدر میں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا جو کہ سفید رنگ کا تھا، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیا۔ (سیرت ابن ہشام ص:۶۱۲)

عمل لواء کا جنگی کارنامہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے حق میں جارہا ہے جو مصنف کے مزعومہ کے خلاف ہے؛ لیکن ہے صحیح، جیسا کہ استاذ الاستاذ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی لاجواب کتاب ''سیرۃ النبی'' ج:۱،ص:۳۲۰،طبع پنجم میں بھی لکھتے ہیں اور مزید یہ ہے کہ:

مہاجرین کا علَم مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا، (قبیلۂ) خزرج کے علم بردار حباب بن منذر رضی اللہ عنہ اور (قبیلۂ) اوس کے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے؛ لیکن مصنف ''المرتضیٰ'' ابن ہشام کی اس صحیح روایت کو چھوڑ کر ابن سعد کی ''الطَّبَقات'' سے قتادہ کا منقطع اثر نقل کر کے آگے چل دیتے ہیں کہ:

''جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے حامل حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے''۔

اور یہ نہیں بتاتے کہ ''الطَّبَقات'' کی روایت اگر ''ابن ہشام کی سیرت کے خلاف ہو تو وہ قابل قبول نہیں''، طبقات ابن سعد کی تحقیق ''أصَحّ السّیَر'' کے مقدمہ میں ملاحظہ ہو۔

نویں خامی

﴿۹﴾ (ب) لگے بندھے حدود سے نکل کر جدید تحقیقی اسلوب میں تضاد بیانی اور عقیدۂ سلف سے ہٹنے کی تحقیق کا ایک اور نمونہ پیش خدمت ہے؛ لیکن ہم پہلے ان حدودِ اربعہ کو متعین کرنا چاہتے ہیں، جن کو مصنف پھاند کر آگے بڑھ گئے ہیں اور اہل سنت والجماعۃ کے مخصوص عقائد کی چہار دیواری کو کتاب وسنت اور اقوال سلف سے محصور کر رہے ہیں، تاکہ جمہور مسلمان اس سے نکلنے کی کوشش نہ کریں اور حدود کا پھاندنا مصنف ہی کو مبارک ہو۔

اہلِ سنت کے حدود (الف، ب، ج، د)

﴿**الف**﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ. (سورة الفتح: ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں، وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں، آپس میں مہربان ہیں۔

﴿**ب**﴾ مَنْ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ رَآهُ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَهُوَ مِنْ أَصْحَابِهِ. (الجامع الصحيح للبخاري ص:۵۱۵)

مسلمانوں میں سے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، وہ صحابی رسول ہیں۔ (بخاری، کتاب المناقب)

بشرطے کہ اسلام کی حالت میں دنیا سے گئے ہوں۔ (فتح الباری)

﴿**ج**﴾ أَمَّا مُعَاوِيَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَهُوَ مِنَ الْعُدُوْلِ الْفُضَلاءِ وَالصَّحَابَةِ النُّجَبَاءِ.

رہے معاویہ رضی اللہ عنہ تو وہ معتبر فضلاء اور شریف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ (نووی شرح مسلم)

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: دَعْهُ (مُعَاوِيَةَ)، فَإِنَّهُ قَدْ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی بات چھوڑو! حقیقت یہ ہے کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت حاصل ہے۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ: هَلْ لَكَ فِيْ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ مُعَاوِيَةَ؟ فَإِنَّهُ مَا أَوْتَرَ إِلَّا بِوَاحِدَةٍ، قَالَ: أَصَابَ إِنَّهُ فَقِيْهٌ. (صحيح بخاري ص: ۵۳۱)

دوسری روایت: امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی آپ کو خبر ہے؟ انھوں نے ایک ہی رکعت وتر پڑھی۔ ابن عباس! یہ درست ہے، وہ فقیہ ہیں۔ (ان کو درجۂ اجتہاد حاصل ہے)۔

خانہ جنگی میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معذور ہیں

﴿د﴾ شرح عقائد نسفی میں ہے:

وَيُكَفُّ عَنْ ذِكْرِ الصَّحَابَةِ إِلَّا بِخَيْرٍ، لِمَا وَرَدَ مِنَ الأَحَادِيْثِ الصَّحِيْحَةِ فِيْ مَنَاقِبِهِمْ .... وَمَا وَقَعَ بَيْنَهُمْ مِنَ الْمُنَازَعَاتِ وَالْمُحَارَبَاتِ فَلَهُ مَحَامِلُ وَتَاوِيْلاتٌ.

اور صحابۂ کرام کا ذکر بغیر بھلائی کے نہیں کیا جائے گا؛ کیوں کہ ان کے فضائل میں صحیح حدیثیں آئی ہیں۔ ....اور جو لڑائی جھگڑے ان کے آپس میں ہوئے، ان کے لئے اچھا محمل اور اچھی تاویلات بہت ہیں۔ (شرح عقائد ص:۱۱۶)

ان تاویلوں میں سے ایک تاویل کو ہم شرح مسلم للنووی سے نقل کرتے ہیں:

جو لڑائیاں ہوگئیں اس میں ہر جماعت کے لئے ایسی ملتی جلتی باتیں ہیں، جن کی وجہ سے ہر ایک نے اپنے کو حق پر ہونے کا اعتقاد کرلیا اور وہ سب کے سب معتبر لوگ تھے، اپنی لڑائی وغیرہ میں تاویل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ان اختلافات نے ان کو عدالت وثقاہت سے خارج نہیں کیا؛ کیوں کہ وہ سب اجتہاد کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، جس طرح بعد کے مجتہدین خون وغیرہ کے معاملات میں اجتہاد کرکے مختلف الرائے ہوئے ہیں، ایسے ہی وہ لوگ بھی اجتہادی مسائل میں مختلف ہوگئے، اس کی وجہ سے ان پر نقص وعیب کا الزام نہیں آتا۔

ان لڑائیوں کا سبب یہ تھا کہ معاملے انتہائی الجھے ہوئے تھے، اس الجھاؤ میں کچھ لوگوں کے اجتہاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلاں فریق حق پر ہے اور جو ان کا مخالف ہے وہ باغی ہے اور امام برحق کی طرف سے ہوکر باغی کی سرکوبی میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے وہ لوگ اس فریق کی طرف ہوگئے اور کچھ لوگوں کے اجتہاد میں دوسری طرف والوں کا حق پر ہونا ثابت ہوا؛ پہلے فریق کو اپنے اجتہاد میں باغی سمجھے اور اس طرف سے نصرت کرنے کو لازم جانا۔

تیسری قسم ایسے لوگوں کی تھی جو کسی کے مکمل برحق ہونے کا یقین نہیں کرتے تھے؛ اس لئے کسی طرف ہوکر لڑنے اور مسلمانوں کے خون بہانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے، ایسے لوگ دونوں فریق سے الگ تھلگ رہے، اگر ان کے اجتہاد میں بھی کسی فریق کی حقانیت واضح ہو جاتی، تو ان کے لئے بھی باغیوں سے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا؛ اس لئے ہر فریق معذور ہے۔ (نووی شرح مسلم، کتاب فضائل الصحابة ج:۲ ص:۲۷۲)

اس تاویل کی تائید صحیح بخاری کی روایات ذیل سے ہوتی ہے:

صحیح بخاری کی ایک حدیث

خانہ جنگی کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی عمدہ تعلقات

دَخَلَ أَبُوْ مُوْسَى وَأَبُوْ مَسْعُوْدٍ عَلَى عَمَّارٍ حَيْثُ بَعَثَهُ عَلِيٌّ إِلَى الْكُوْفَةِ يَسْتَنْفِرُهُمْ، فَقَالا: مَا رَأَيْنَاكَ أَتَيْتَ أَمْرًا أَكْرَهَ عِنْدَنَا مِنْ إِسْرَاعِكَ فِيْ هَذَا الأَمْرِ مُنْذُ أَسْلَمْتَ، فَقَالَ عَمَّارٌ: مَا رَأَيْتُ مِنْكُمَا مُنْذُ أَسْلَمْتُمَا أَمْرًا عِنْدِيْ مِنْ إِبْطَائِكُمَا عَنْ هَذَا الأَمْرِ. فَقَالَ أَبُوْ مَسْعُوْدٍ - وَكَانَ مُوْسِرًا -: يَا غُلامُ! هَاتِ حُلَّتَيْنِ، فَأَعْطَى إِحْدَاهُمَا أَبَا مُوْسَى وَالأُخْرَى عَمَّارًا. (کتاب الفتن ص:۱۰۵۲)

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عمار رضی اللہ عنہ کو کوفہ اس لئے بھیجا کہ وہاں والوں کو جنگ میں شریک ہونے پر آمادہ کریں، تو حضرت ابوموسیٰ اشعری اور ابومسعود بدری رضی اللہ عنہما حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور دونوں نے کہا: جب سے آپ مسلمان ہوئے ہیں؛ آج تک ہم نے آپ کی کوئی بات ایسی ناگوار نہیں دیکھی تھی، جتنی آپ کی شرکت جنگ میں جلد بازی سے ہم کو ہوئی، حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے بھی آپ دونوں کی کوئی ایسی ناگوار بات آج تک نہیں دیکھی تھی، جتنی آپ دونوں کی اس جنگ میں شرکت سے تاخیر کرنے میں پا رہا ہوں، پھر ابومسعود رضی اللہ عنہ جو خوش

حال تھے، انھوں نے غلام سے دو حلے منگوائے اور ایک ابوموسیٰ کو دیا اور دوسرا عمار کو عطا فرمایا۔

دوسری روایت صفحہ۱۰۵۳ میں یوں ہے:

إنّ حَرمَلَةَ قَالَ: أرْسَلَنِيْ أسَامَةُ إلَی عَلِيٍّ وَقَالَ: إنَّهُ سَيَسْأَلُکَ الآنَ، فَيَقُوْلُ: مَا خَلَّفَ صَاحِبَکَ؟ فَقُلْ لَهُ: يَقُوْلُ: لَوْ كُنْتَ فِيْ شِدْقِ الأسَدِ لأحْبَبْتُ أنْ أكُوْنَ مَعَکَ فِيْهِ؛ لٰكِنْ هٰذَا أمْرٌ لَمْ أرَهُ.

حرملہ کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ دیکھو! وہ تم سے پوچھیں گے کہ تمہارے ساتھی (اسامہ اس جنگ میں) ہم سے کیوں کٹے رہ گئے؟ تو تم کہنا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر آنجناب شیر کے جبڑوں کے بیچ میں پڑ جائیں، تو اس مصیبت میں بھی آپ کے ساتھ ہی رہنے کو پسند کرتا ہوں؛ لیکن جنگ میں شریک ہونے کی میں رائے نہیں رکھتا۔

یہ تینوں صاحبان: حضرت اسامہ، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہم مسلمانوں کی اس خانہ جنگی میں کسی کی طرف نہیں تھے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک سرگرم کارکن تھے، ان کے اجتہاد میں صحابۂ مذکورین کا شریک نہ ہونا غیر پسندیدہ امر تھا اور ان حضرات کے اجتہاد میں کسی طرف شریک نہ ہونا ہی پسندیدہ امر تھا اور شریک ہونے والوں کو ناپسند کرتے تھے، اس اختلاف کے باوجود ان کے آپس کے تعلقات اس قدر شگفتہ تھے کہ ابومسعود رضی اللہ عنہ نے ایک جوڑا نیا کپڑا منگا کر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو بھی دیا۔

شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا باعظمت بیان

﴿۵﴾ اس کے بعد ہم عصر حاضر کے مجدد، اہل حق کے بلا اختلاف مرجع کی مشہور کتاب ''حکایات صحابہؓ'' کے خاتمہ سے چند سطریں پیش کرتے ہیں اور ناظرین کرام سے گذارش کرتے ہیں کہ پوری بحث جو صرف دو ورق میں ہے؛ بغور ملاحظہ فرمائیں۔

آپ ہیں حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ حدودِ شرعیہ میں سخت پابند اور مصنف محقق بھی حضرت شیخ علیہ الرحمہ کے نیاز مندوں میں سے ہیں۔ ''حکایات صحابہ'' کو اسی باب پر ختم فرماتے ہیں اور اس مضمون کو مشہور اہل سنت بزرگ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی ''شفاء'' سے نقل کیا ہے:

''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اعزاز واکرام میں داخل ہے؛ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا اعزاز واکرام کرنا، ان کے حق کو پہچاننا اور ان کا اتباع کرنا اور ان کی تعریف کرنا، ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا اور ان کے آپس کے اختلافات میں لب کشائی نہ کرنا، مورخین اور شیعہ، بدعتی اور جاہل راویوں کی ان خبروں سے اعراض کرنا، جو ان حضرات کی شان میں نقص پیدا کرنے والی ہوں اور اس نوع کی کوئی روایت اگر سننے میں آئے تو کوئی اچھی تاویل کرے اور کوئی اچھا محمل تجویز کرے کہ وہ اس کے مستحق ہیں اور ان حضرات کو برائی سے یاد نہ کرے؛ بلکہ ان کی خوبیاں اور ان کے فضائل بیان کرے اور عیب کی باتوں سے سکوت، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر ہو (بُرا ذکر) تو سکوت کیا کرو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل قرآن شریف اور احادیث میں بکثرت وارد ہیں''۔

پھر قرآن شریف کی آیتیں چار جگہوں سے نقل کی ہیں اور دسیوں حدیثوں کا ترجمہ نقل کیا ہے، اس میں سے ایک یہ ہے:

''اللہ سے میرے صحابہ کے بارے میں ڈرو، ان کو ملامت کا نشانہ نہ بناؤ، جو شخص ان سے محبت رکھتا ہے، میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے، وہ میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے، جو شخص ان کو اذیت دے، اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھ کو اذیت دی اس نے اللہ کو اذیت دی اور جو شخص اللہ کو اذیت دیتا ہے، قریب ہے کہ وہ پکڑ میں آجائے''۔

(ص:۱۸۱، طبع اشاعت دینیات، دہلی)

المرتضیٰ کا سب سے بڑا المیہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ریمارک

اب آپ ''المرتضیٰ'' کے مصنف کا ریمارک پڑھئے اور دیکھئے کہ کس بے باکی سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک دنیا دار حاکم، خوف وخشیت الٰہی سے خالی بتا رہے ہیں، جس کو کسی مصری عالم کے حوالے سے صفحہ نمبر ۳۱۳ تا ۳۱۵ میں نقل کرتے ہیں اور اس مہمل بات کو رد کرنے کے بجائے اس کی توہین کو سراہتے ہیں؛ بلکہ بین القوسین اسمائے گرامی اپنی طرف سے بڑھا کر توہین کرنے والے کی اعانت بھی کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''استاذ العقاد نے بڑی خوبی کے ساتھ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلاف کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ اختلاف دو آدمیوں کے درمیان نہیں؛ بلکہ دو نظاموں کے درمیان تھا، اگر نئی تعبیر اختیار کی جائے تو کہا جائے گا: یہ اختلاف دو مکتب فکر کا اختلاف تھا، مسئلہ یہ تھا کہ وہاں تصادم تھا خلافت اسلامیہ کے درمیان (جس کی نمائندگی حضرت علی رضی اللہ عنہ کررہے تھے) اور دنیاوی حکمراں کے طریقہ کے درمیان (جس کی نمائندگی حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کررہے تھے)''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اس مسئلہ میں فیصلہ کن بات یہ نہیں تھی کہ علی رضی اللہ عنہ غالب آجائیں اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی جگہ حکومت کریں، یا معاویہ رضی اللہ عنہ غالب آکر علی رضی اللہ عنہ کی جگہ لیں؛ بلکہ معاملہ وہاں اصول ونظام حکومت کا تھا کہ وہ کیا ہو؟ خلافتِ دینیہ یا دنیا دارانہ ملوکیت، یا یوں کہئے کہ خدا پرستی اور خشیت الٰہی پر مبنی نظام ہو، یا نئی نئی آئی ہوئی دولت کی بنیاد پر زندگی گزارنے کا نظام ہو، جیسا کہ دوسری مفتوحہ علاقوں سے آئی ہوئی دولت شہروں شہروں بٹی، سرداران قبائل، سپاہیوں اور انصار و مددگار لوگوں کے

درمیان تقسیم ہوتی رہی؛لہذا فیصلہ کن اور مکمل فیصلہ کن بات یہ تھی کہ کون سے اصول غالب کئے جائیں، بادشاہی اصول، یا خلافت نبوی کے اصول،علی ومعاویہ رضی اللہ عنہما دونوں کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا،خواہ وہ اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیتے،الا یہ کہ ان اصولوں میں سے ایک کو اپنائیں''۔

صحابی رسول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں اس قلم کار کی گستاخی ملاحظہ کرنے کے بعد خود اسی کتاب میں اس سے متضاد بیانات بھی پڑھتے چلئے جو بلا تحقیق رطب ویابس اقتباسات سے کتاب کی ضخامت بڑھانے کا ناگزیر ردعمل ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے شب و روز

اس کتاب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظیم شخصیت خود مصنف کی عبارت میں ملاحظہ کیجئے:

''ان کے یہاں (معاویہ رضی اللہ عنہ کے یہاں) دن رات میں پانچ مرتبہ اذن عام تھا، وہ صبح نماز فجر سے فارغ ہوتے تھے تو بیٹھ جاتے اور پچھلے حوادث و واقعات کی داستان سنتے، پھر دولت خانہ تشریف لے جاتے اور قرآن مجید کے ایک پارہ کی تلاوت کرتے، پھر مکان پر جا کر انتظامی ہدایات دیتے، پھر چار رکعت نماز پڑھتے اور خواص الخواص کو آنے کی اجازت ہوتی اور ان سے تبادلۂ خیال کرتے، پھر مشیرانِ سلطنت حاضر ہوتے اور اس دن کے کرنے والے کاموں کی اطلاع دیتے، پھر کچھ ناشتہ فرماتے، پھر ایک بار گھر جا کر باہر تشریف لاتے، مسجد میں کرسی لگا دی جاتی اور آپ کے پاس کمزور، بادیہ کا رہنے کا اعرابی، بچہ، عورت، بے کس اور لاوارث آدمی آتا، آپ فرماتے اس کا لحاظ واحترام کرو، کوئی کہتا کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی، آپ فرماتے کہ اس کے معاملے کی تحقیق کرو، جب کوئی باقی نہ رہتا تو مجلس سے اٹھتے، چارپائی پر بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ لوگوں کو ان کی حیثیت کے مطابق آنے دو، جب سب بیٹھ جاتے تو فرماتے: صاحبو! ان لوگوں کی ضروریات ومسائل کو ہم تک پہنچایا کرو؛ جو خود نہیں پہنچ سکتے، اسی لئے اللہ نے تم

کواعزاز بخشا ہے پھر ہر ایک کے معاملہ اور ضرورت کے مطابق ہدایات دیتے، روزانہ کا یہی معمول تھا''۔ (المرتضیٰ ص:۳۲۲ تا ۳۲۳، مختارات ص:۷۰ تا ۷۲)

ان صحیح واقعات کو دیکھیں اور مصری عالم کے اقتباس کو دیکھ ہی چکے ہیں اور فیصلہ کریں کہ جس شخصیت کے شب و روز اس طرح گزرتے ہوں ان کو خوف وخشیت الٰہی سے خالی بتانا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ایک اجتہادی غلطی اور اس میں تکوینی حکمتیں

رہا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مد مقابل ہو کر بیعت نہ کرنا تو اس میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے کہ خلافت کے معاملے میں حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، اور فریق مقابل ایک اجتہادی غلطی کا مرتکب تھا۔ (دیکھو المرتضیٰ ص:۳۲۳ اور ۴۲۹)

اس اجتہادی غلطی پر طعن وتشنیع اور خوف الٰہی سے خالی ہونے کا الزام دینا کسی طرح صحیح نہیں کہا جاسکتا اور تکوینی طور سے اسلام کے لئے ایک عملی نمونہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فراہم کردیا کہ باغیوں کے تمام مسائل انہیں مشاجراتِ صحابہ سے مستنبط ہوئے ہیں، غرض اپنی عزت کو داؤ پر لگا کر عامۃ المسلمین پر احسانِ عظیم کرگئے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ وَعَنۡ كُلِّ الصَّحَابَةِ أَجۡمَعِيۡنَ.

المرتضیٰ کی دسویں خامی

﴿۱۰﴾ علم الانساب میں غلطیوں کے نمونوں میں سے پہلا نمونہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانیوں کے لئے قریش نے نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا؛ بلکہ آپ کے پورے خاندان کا بائیکاٹ کردیا تھا، تاریخ اسلام میں

اس واقعہ کو ''مقاطعہ'' اور ''شعبِ ابی طالب میں محصوری'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، المرتضیٰ کے مصنف نے سیرۃ ابن ہشام کے حوالے سے اس کو ''جدید تحقیق'' کتاب میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

﴿الف﴾ ''............بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے بارے میں معاہدہ کرلیں کہ ان کے خاندان سے شادی بیاہ کے تعلقات منقطع کر لئے جائیں، .... خاندان ہاشم اور خاندان عبدالمطلب کے افراد نے ابوطالب کا ساتھ دیا۔ (المرتضیٰ ص:۳۸)

عبدالمطلب تو ہاشم کے فرزند ہیں، پس جب ہاشم کے خاندان کا قریش نے بائیکاٹ کردیا، تو ان کے لڑکے عبدالمطلب کے خاندان کا بھی بائیکاٹ ہوگیا، اسی طرح جب سب بنی ہاشم نے خواجہ ابو طالب کا ساتھ دے دیا، جس میں بنو عبدالمطلب بھی آ گئے، تو خاندان عبدالمطلب کے افراد کو الگ سے ذکر کرنا چہ معنی؟

دراصل مصنف سے یہ غلطی ہوگئی ہے کہ انھوں نے ہاشم کے بھائی مطّلب کو عبدالمطلب (فرزند ہاشم) سمجھ لیا ہے، عبد مناف کے چار لڑکے تھے: ایک ہاشم، دوسرے مطّلب، تیسرے عبد شمس اور چوتھے نوفل۔

اس مقاطعہ میں خاندان نوفل اور خاندان عبد شمس کے محروم الاسلام لوگ قریش کے ساتھ ہوگئے تھے اور پورے خاندان مطّلب اور (ابولہب کے سوا) پورے خاندان ہاشم کے لوگوں نے خواجہ ابوطالب کا ساتھ دیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری مدد کریں گے۔

اس مضمون کے ماخذ سیرت ابن ہشام میں کئی جگہ اس مقاطعہ کا ذکر ہے؛ لیکن ہر جگہ ''بنی المطلب'' لکھا ہے، کہیں ''بنی عبدالمطلب'' نہیں لکھا ہے، دیکھو مطبوعہ مصطفیٰ البابی ۱۳۷۵ھ ابن ہشام ۳۵۰، ۳۷۴، ۲۶۹۔

ہم پہلے یہ سمجھے کہ یہ فاحش غلطی کاتب کی بے احتیاطی سے ہوگئی ہوگی، تو ہم نے ''نبی رحمت'' کا مراجعہ کیا، تو اس میں بھی بعینہ یہی غلطی ہے، اس وجہ سے ذمہ دار مصنف محقق کو ہی ہونا چاہئے۔

دوسرا نمونہ

﴿ب﴾ المرتضیٰ صفحہ نمبر ۱۷ میں غزوۂ بدر کے مبارزین میں ایک نام ''عبیدہ'' آیا ہے، حاشیہ میں لکھتے ہیں: ان کا پورا نام عبیدۃ بن الحارث بن عبدالمطلب بن عبدمناف ہے۔

یہاں بھی مُطّلب کو محشی صاحب نے عبدالمطلب بنادیا ہے۔

تیسرا نمونہ

﴿ج﴾ المرتضیٰ صفحہ: ۲۰۸

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جانشینی کے وقت اکثر و بیشتر مفتوحہ ممالک کے گورنر اور زیادہ تر اسلامی افواج کے سربراہ اموی تھے''۔

یہاں تک صحیح ہے، پھر آگے ان امویوں میں ''حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ'' کو بھی شمار کرایا ہے، جو قطعاً غلط ہے؛ کیوں کہ ''امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف''، ''عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف'' کا چچازاد بھائی ہے اور عمرو بن العاص کے نسب نامہ میں امیہ سے لے کر عبدمناف تک کسی کا پتہ نہیں ہے، دیکھئے: الاستیعاب لابن عَبد البَرّ.

عَمْرُو بْنُ العَاصِ بْنِ وَائِلِ بْنِ هَاشِمِ بْنِ سَعِيْدِ بْنِ سَهْمِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ هُصَيْصِ بْنِ كَعْبِ بْنِ لُؤَيّ. (آگے شجرہ نسب نبوی)

شاید عمرو بن العاص السہمی کو ''عَبْشَمِيّ'' سمجھ لیا گیا ہو، یا ''اکثر و بیشتر'' کے بعد بھی ''تغلیب'' کی ضرورت محسوس ہوئی ہو، ورنہ یہ سبقت قلمی یقیناً غلط ہے۔

المرتضیٰ میں ادبی غلطیوں کے نمونے

﴿۱۱﴾ صاحبِ ذوق ادیب کی ادیبانہ غلطیاں بھی نظر آئیں، ان کا نمونہ بھی دیکھتے چلئے:

﴿الف﴾ ''آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ سورۂ براۃ کی ابتدائی آیتیں لے کر جاؤ اور قربانی کے دن (۱۰/ذی الحجہ کو) لوگوں کو سنا دینا اور بتا دینا کہ جنت میں کوئی کافر نہیں جائے گا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا، خانۂ کعبہ کا طواف کوئی ننگے جسم نہیں کرے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی بھر اس کے پابند رہیں گے''۔ (المرتضیٰ ص:۸۷)

آخری جملہ نئی تحقیق ہے، ''سورۂ براءۃ کی ابتدائی آیتیں''، ملاحظہ فرمائیں، جن کو سنانے کے لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مکہ معظّمہ بھیجا گیا، ابن ہشام ''السیرۃ النبویۃ'' میں صفحہ نمبر ۵۴۵ سے ۵۴۶ تک پورے واقعے کی تصویر کھینچ رہے ہیں، وہیں سے مصنف نے اس مضمون کو لیا ہے۔

﴿ إِلَّا الَّـذِيْـنَ عَـاهَـدْتُـمْ مِـنَ الْـمُشْرِكِيْنَ ﴾، أيْ العَهْدَ الخَاصَّ إِلَى الأَجَـلِ المُسَمَّى، ﴿ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوْا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ ﴾.

یعنی جن مشرکین سے ایک خاص مدت تک کے لئے تمہارا معاہدہ ہو گیا ہے اور ان لوگوں نے کوئی بدعہدی نہیں کی اور نہ ہی تمہارے خلاف کسی کی مدد کی، تو تم لوگ ان کا معاہدہ پوری مدت بھر نباہ دو۔

اس کے بعد ابن ہشام لکھتے ہیں:

وَأَجَّـلَ الـنَّـاسَ أَرْبَـعَةَ أَشْهُـرٍ مِـنْ يَـوْمٍ أَذَّنَ فِيْهِمْ لِيَرْجِعَ كُلُّ قَوْمٍ إِلَى مَـأْمَـنِهِـمْ أَوْ بِـلادِهِـمْ، ثُـمَّ لا عَهْـدَ لِمُشْرِكٍ وَلا ذِمَّةَ، إلَّا أَحَدٌ كانَ لَهُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَهْدٌ إِلَى مُدَّةٍ، فَهُوَ لَهُ إِلَى مُدَّتِهِ.

تمام لوگوں کو اعلان کے دن سے چار مہینہ کی اس لئے مہلت دی کہ وہ اپنے ٹھکانوں پر یا اپنے شہروں میں چلے جائیں، پھر کسی مشرک کے لئے کوئی ذمہ داری نہیں،

ہاں! جس کا معاہدہ مدت معینہ کے لئے ہوا ہو، تو اس کو اتنی مزید مہلت ملے گی۔

بتایئے! کہیں پتہ چلا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر کسی سے معاہدہ کیا ہو، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی بھر اس کے پابند رہیں گے؟ مگر ''زبان و اسلوب کے واقف کار'' نئے ''اسلوب'' سے ''تحقیقی مضمون نگار'' نے ''معاہدہ کی مدت بھر'' کو ''رسول کی زندگی بھر'' بنا دیا، اس سے زیادہ صاف عبارت جامع الترمذی کتاب الحج ص: ۱۰۶، رشیدیہ ج ا میں ملاحظہ فرمایئے اور ادب کے مدعی کی داد دیجئے:

عَنْ زَيْدِ بْنِ أثيع قَالَ: سَألْتُ عَلِيًا: بِأيِّ شَيْءٍ بُعِثْتَ؟ قَالَ: بِأرْبَعٍ: لا يَدْخُلُ الجَنَّةَ إلاَّ نَفْسٌ مُسْلِمَةٌ، وَلا يَطُوْفُ بِالبَيْتِ عُرْيَانٌ، وَلا يَجْتَمِعُ المُسْلِمُوْنَ وَالمُشْرِكُوْنَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا، وَمَنْ كانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهْدٌ، فَعَهْدُهُ إلَى مُدَّتِهِ، وَمَنْ لا مُدَّةَ لَهُ فَأرْبَعَةُ أشْهُرٍ.

زید بن اثیع کہتے ہیں: میں نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کیا لے کر بھیجے گئے تھے؟ انھوں نے کہا چار باتیں: جنت میں صرف مسلمان ہی جائے گا، کوئی ننگا خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کرے گا، اس سال کے بعد حج کے موقع پر مسلمان اور مشرکین اکٹھا نہ ہوں گے اور جس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ کسی معین مدت کے لئے ہوگا، وہ مدت پوری کی جائے گی اور جس کی کوئی مدت نہ ہوگی اس کی مہلت چار مہینہ ہوگی۔

دوسری ادبی غلطی

﴿ب﴾ ''وَفَاءُ الوَفا'' اور ''البُرهان'' کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''مسجد نبوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کچی اینٹوں سے بنی تھی، چھت کھجور کے تنوں کی تھی''۔ (المرتضیٰ ص: ۲۱۲)

اصل عبارت جامع صحیح البخاری کے مطابق یوں ہے:

إنَّ المَسْجِدَ كانَ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَبْنِيًا

بِاللَّبِنِ وَسَقَفُهُ الجَرِيْدُ. (بخاری ص:۶۴ ج۱)

اس ''الجَرِيْد'' کا ترجمہ مترجم علام سے غلط ہوگیا، کھجور کے تنوں کو ''جُذُوْع'' کہا جاتا ہے، ٹہنیوں کو ''جَرِيْد'' کہتے ہیں، یعنی مسجد کی چھت کھجور کی ٹہنیوں کی تھی؛ نہ کہ تنوں کی۔

تیسری لغوی وادبی غلطی

﴿ج﴾ ''احمد عبداللہ بن رزین کے حوالے سے کہتے ہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے میری طرف خربوزہ بڑھایا، ہم نے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ نے یہ بط کھلائی ہوتی''۔ (المرتضیٰ ص:۳۰۵)

اصل عبارت ''البداية والنهاية'' کی ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ رَزِيْنٍ أَنَّهُ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ ــ قَالَ حَسَن: يَوْمَ الأَضْحَى ــ فَقَرَّبَ إِلَيْنَا خَزِيْرَةً، فَقُلْنَا: أَصْلَحَكَ اللّٰهُ لَوْ أَطْعَمْتَنَا هَذَا البَطَّ. (ج:۸، ص:۳)

''خزیرہ'' ایک خاص قسم کی نمکین لپسی ہوتی ہے، جو چوکر سے بنتی ہے، قدرتی پھل کا نام نہیں ہے۔

لیکن مترجم محقق نے ''خربز'' سمجھ کر خربوزہ ترجمہ کردیا۔

صحیح بخاری (۸۱۳) الخَزِيْرَةُ مِنَ النُّخَالَةِ وَالحَرِيْرَةُ مِنَ اللَّبَنِ (خزیرہ چوکر سے بنتا ہے اور حریرہ دودھ سے)۔

پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت لائے ہیں کہ ان کے گھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد متعین کرنے کے لئے آئے، گھر کے اندر ایک خاص جگہ میں نماز پڑھی۔ اس کے بعد ہے:

فَحَبَسْنَاهُ عَلَى خَزِيْرَةٍ صَنَعْنَاهُ (ہم نے خزیرہ کھانے کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روک لیا؛ جو ہم نے بنایا تھا)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم (ج ا ص:۲۳۳) میں اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ اگر اس میں گوشت بھی ہو تو خزیرہ کہیں گے اور اگر گوشت نہ ہو تو ''عصیدہ'' کہلائے گا الخ؛ لیکن اس کا ترجمہ ''خربوزہ'' ایجاد بندہ ہے۔

دلچسپ خامیاں

﴿۱۲﴾ اس کے علاوہ بھی کتاب ''المرتضیٰ'' میں دل چسپ خامیاں موجود ہیں، اس کے بھی چند نمونے پیش خدمت ہیں:

﴿**الف**﴾ حدیث میں ہے: ''**خَيْرُ نِسَاءٍ رَكِبْنَ الإِبِلَ صَالِحُ نِسَاءِ قُرَيْشٍ**''، یعنی اہل عرب کی عورتوں میں بہتر عورتیں قریش کی عورتیں ہیں۔

جو صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کو بیان کرتے تو زور سے فرماتے: ''**مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ لَمْ تَرْكَبْ بَعِيْرًا قَطُّ**'': یعنی حضرت مریم علیہا السلام پر قریشی عورتوں کی فضیلت نہیں لازم آتی؛ کیوں کہ مریم بنت عمران علیہا السلام کبھی اونٹ پر سوار نہیں ہوئیں، لیکن ''المرتضیٰ'' کے محشی صاحب نے ایک انوکھا معنی ایجاد کیا؛ کہتے ہیں: ''اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں سب سے بہتر کا مطلب ہے شریف زادیاں اور آزاد خواتین''، شاید مترجم جیسے لوگ حضرت مریم علیہا السلام کو شریف زادیوں اور آزاد خواتین سے خارج سمجھتے ہوں۔

دوسری دلچسپ غلطی

﴿**ب**﴾ ''المرتضیٰ'' ص:۳۰۵ میں ہے:

''مجمع'' میں سمعان التیمی سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لئے بازار کی طرف گئے اور وہاں جا کر کہا: کون مجھ سے یہ تلوار خریدتا ہے؟............اھ

یہ ''مجمع'' کون سی کتاب ہے؟ ''مجمع الزوائد'' یا ''مجمع بحار الانوار'' جس میں سمعان التیمی سے روایت ہے؟ اس پر ایک لطیفہ سنئے:

استاذ محترم علامہ محمد ابراہیم بلیاوی علیہ الرحمہ نے سنایا کہ ایک جاہل آدمی حج کرنے گیا، جب واپس آیا تو وہاں کے عجائب کو بڑی شان وشوکت سے بیان کرتا تھا، کسی نے پوچھا کہ وہاں پر آپ نے ''مقام ابراہیم'' بھی دیکھا تھا؟ حاجی صاحب نے جواب دیا: دیکھنے کی کیا بات ہے، ہم نے تو ان کا وعظ بھی بار بار سنا، سائل نے مزاحاً دوسرا سوال کر دیا کہ آپ نے ''مقام ابراہیم'' صاحب کا وعظ بھی سنا؟ تو جواب دیا کہ تم کو کیوں تعجب ہے؟ ''مقام ابراہیم'' صاحب ہم لوگوں کو بہت مانتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو رخصت کرنے حرم شریف کے باہر تک آئے تھے۔

صاحبِ انڈکس کی علمی صلاحیت

تو جیسے ان حاجی صاحب نے مقام ابراہیم کو آدمی سمجھ لیا تھا، اسی طرح سے مترجم نے ''مجمع بن سمعان التیمی'' کے ''مجمع'' کو کتاب سمجھ کر بین الواوین ''مجمع'' لکھ دیا اور صاحب ''انڈکس'' نے تو ''مجمع بحارالانوار'' لکھ کر صریح غلطی کی ہے، ع

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

''البداية و النهاية'' سے اصل عبارت کو ملاحظہ فرمائیے:

وَقَالَ يَعْقُوبُ بْنُ سُفْيَانَ: حَدَّثَنَا أَبُوْ بَكْرٍ الْحُمَيْدِيُّ ثَنَا سُفْيَانُ أَبُوْ حَسَّانٍ عَنْ مُجَمِّعِ بْنِ سَمْعَانَ التَّيْمِيِّ قَالَ: خَرَجَ عَلِيُّ بْنُ أَبِيْ طَالِبٍ بِسَيْفِهِ إِلَى السُّوْقِ، فَقَالَ: مَنْ يَشْتَرِيْ مِنِّيْ سَيْفِيْ هَذَا. (ج:۸ ص:۳)

یعنی سفیان ابوحسان نے مجمع بن سمعان تیمی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ......
............۔

﴿ج﴾ **لا يَقْتَسِمُ وَرَثَتِيْ دِيْنَارًا وَلا دِرْهَمًا، مَا تَرَكْتُ بَعْدَ نَفَقَةِ نِسَائِيْ وَمُعُوْنَةِ عَامِلِهِ فَهُوَ صَدَقَةٌ.**

میرے ورثہ دینار و درہم آپس میں تقسیم نہیں کریں گے، میں نے اپنی بیویوں کے خرچ اور اس کے عامل کی مدد کے علاوہ جو چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے۔ (المرتضیٰ ص:۱۳۷)

آخری ٹکڑے کا ترجمہ اس لئے مہمل ہوا کہ اصل سے ملایا نہیں گیا، ورنہ مسند احمد (مرجع کتاب) میں چار جگہ یہ حدیث ہے اور حدیث کی کئی کتابوں میں بھی یہ روایت موجود ہے اور ہر جگہ "مؤنة عاملي" ہے، "معونة" اور "عامله" نہیں ہے۔

ایک اور خامی

﴿۱۳﴾ ''انسان کے اندر خون اور خاندان کے اثرات بڑی حد تک موجود رہتے ہیں''۔ اس نظریہ کو ثابت کرتے ہوئے ایک حدیث کو پیش کیا ہے، جو حدیث کی اکثر کتابوں میں ہے؛ لیکن اس حدیث کا آخری ٹکڑا کسی ''خاص مصلحت'' کی وجہ سے ترک کردیا اور متداول کتابوں کو چھوڑ کر مسند احمد ج۲ ص:۵۳۵ کا حوالہ دیا ہے، تو ہم کو خیال گزرا کہ شاید مسند شریف میں وہ ٹکڑا موجود نہ ہو؛ لیکن حیرت ہوئی جب دیکھا کہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مسند شریف میں اس حدیث کو اسی ٹکڑے کے ساتھ نقل کیا ہے، جس طرح عام محدثین نے نقل کیا ہے، تو مجبوراً ہم نے مصنف کے اس عمل کو وقتی مصلحت قرار دیا؛ لیکن اصل وجہ تو مصنف محقق ہی بتلا سکتے ہیں، وہ حدیث شریف یوں ہے: النَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ الفِضَّةِ وَالذَّهَبِ، خِيَارُهُمْ فِيْ الجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِيْ الإِسْلامِ.

لوگ کانیں ہیں، جیسے چاندی اور سونے کی کانیں ہوں، ان میں جو لوگ جاہلیت کے زمانہ میں ممتاز تھے وہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی ممتاز رہے۔ (مسند احمد ص:۵۳۵)

یہاں تک مصنف نے ذکر کیا، اس کے آگے یہ ٹکڑا مسند میں بھی موجود ہے: "إِذَا فَقِهُوْا" اور بعض طرق میں "إِذَا فَقِهُوْا فِيْ الدِّيْنِ" بھی ہے، یعنی ممتاز رہنے کی شرط یہ ہے کہ وہ دین میں دانائی اور سمجھ حاصل کرلیں۔

بخاری اور مسلم میں مختلف الفاظ میں یہ حدیث کئی جگہ موجود ہے اور ہماری نظر میں

ہر جگہ اسی شرط کے ساتھ مشروط ہے، تو بالفرض اگر یہ ٹکڑا مسند احمد میں نہ بھی ہوتا، تو دوسرے طرق سے یہ شرط ملحوظ مانی جاتی؛ لیکن جب مسند احمد میں بھی یہ شرط موجود ہے، تو سوائے کسی خاص مصلحت کے اور کیا وجہ بن سکتی ہے، جس کی وجہ سے مصنف نے ادھوری بات نقل کی؟

المرتضی میں کتابت کی غلطیاں مع حوالہ

﴿۱۴﴾ ان تیرہ قسم کی خامیوں کے علاوہ کتابت کی غلطیاں بھی کتاب ''المرتضیٰ'' میں پائی گئیں، ان کی تصحیح کے لئے ایک صحت نامہ لکھ کر ناشرین نے شائع کیا ہے؛ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سی غلطیاں رہ گئیں، ''صحت نامہ'' تیار کرنے والوں کو اس کا لحاظ کر کے ایک مفصل غلط نامہ لکھ دینا چاہئے، چھوٹی بڑی ایک دو غلطیوں کی نشاندہی ہم بھی کر دیتے ہیں:

صفحہ	غلط	صحیح	کیفیت
۲۸ (حاشیہ)	مسند الامام احمد بن حنبل ج:۲ ص:۵۳۵	مسند الامام احمد بن حنبل ج:۲ ص:۵۳۹	اس میں مطبع کا بھی فرق ہوسکتا ہے۔
۱۳۷	بعد نفقة نسائي ومعونة عامله	بعد نفقة نسائي ومؤنة عاملي	....
۱۵۷	حضرت ابوبکر الصدیق کی زندکی	حضرت ابوبکر الصدیق کی زندگی	گاف کا ایک مرکز چھوٹ گیا۔
۲۶۰	عبداللہ بن وہب الراسدی	عبداللہ بن وہب الراسبی	ابوداوٗد
۲۷۹	ولكن لا رأى لمن يطاع (کو تین بار فرمایا)	ولكن لا رأى لمن لا يطاع (کو تین بار فرمایا)	''لا'' چھوٹنے کی وجہ سے معنی الٹ گیا۔

ایک پرانا اثر

عرصہ تک مصنف مدظلہ، علامہ مودودی کی قائم کردہ جماعت بنام ''جماعت اسلامی'' کے سرگرم کارکن؛ بلکہ اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی رہ چکے ہیں، بعد میں اس جماعت سے علیحدہ ہوئے، تو جماعت سے ضابطہ کا تعلق اگر چہ نہیں رہا؛ مگر ''رفقائے جماعت'' سے دوستانہ وعزیزانہ تعلقات اور برابر ایک دوسرے کا احترام اور اعتراف برقرار رہا؛ علیحدگی کے بعد ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' نام کا ایک کتابچہ لکھ کر علامہ مودودی صاحب کے بعض افکار ونظریات سے اختلاف کیا ہے؛ مگر ''عنفوان شباب'' میں علامہ مودودی صاحب سے مصنف کے اندر جو مودودیت کے اثرات پیدا ہو چکے تھے، وہ ''دین کی تفہیم وتشریح'' کے بعد بھی ختم نہیں ہوئے، مصنف مدظلہ نے ''پرانے چراغ'' حصہ دوم میں (صفحہ۳۰۴مطبوعہ ۱۹۸۰ء)اعتراف کیا ہے:

''میں نے ان کی کتابوں اور تحریروں سے (علامہ مودودی کی) بہت استفادہ کیا اور میری تحریر میں اس کا رنگ آیا''۔

یہ رنگ محض طرز تحریر اور اسلوب نگارش ہی میں نہیں ہے؛ بلکہ ''المرتضیٰ'' میں یہ رنگ افکار ونظریات میں بھی مودودی صاحب کے ہم آہنگ ہے، پہلے مودودی صاحب کی عبارت ملاحظہ کیجئے، جس میں انھوں نے اصول حدیث اور اسناد حدیث پر نقد کیا ہے، ''ترجمان القرآن'' ج۴۱ص:۱۱۱ کے حوالہ سے ''تحفہ مودودیہ'' میں ہے:

''اصول روایت کو تو چھوڑ یئے کہ اس دورِ تجدید میں اگلے وقتوں کی بکواس کون سنتا ہے .... اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے .... جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے، اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے، جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے، جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت؛ کہ وہ

جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔..................وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج سناش ہوجاتا ہے کہ روایت کو دیکھ کر اس کی بصیرت اسے بتادیتی ہے کہ ان میں سے کون سا فعل اور کون سا قول میرے سرکار کا ہوسکتا ہے ....اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا، وہ اسناسے ضرور مدد لیتا ہے؛ مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا، وہ بسا اوقات ایک غریب منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو لے لیتا ہے؛ اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی احتراز کرجاتا ہے؛ اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے، وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ چیز ذوقی ہے، ضابطہ کے تحت نہیں آتی''۔

مودودی صاحب کی بات ختم ہوئی۔

دیکھئے اس میں علامہ صاحب نے احادیث کے ردوقبول کا معیار اپنے اعلیٰ ذوق کو قرار دیا اور اپنی بصیرت کو جوہری کی بصیرت سے تشبیہ دے کر یہ دعوی کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہوجاتا ہے کہ اس کی بصیرت اسے خود بتادے کہ کون سا قول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوسکتا ہے، اسناد کی بہت زیادہ ضرورت نہیں رہتی۔

علامہ مودودی سے مصنف کی ہم آہنگی

اب اس کتاب ''المرتضیٰ'' میں اس نظریہ کی ہم آہنگی تاریخ وسیرت کے بارے میں ملاحظہ فرمایئے، اس میں سے ایک کلام تو وہی ہے، جس کو ہم احمد حسن الزیات کی بات پر مصنف مدظلہ کی تنقید لاطائل میں لکھ چکے ہیں۔

لیکن ایک صاحب بصیرت ناقد جس کو اس عصر کی زبان واسلوب سے واقفیت اور اس کا ذوق ہے، وہ جانتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کو استثنائی طور پر کیا وہی صلاحتیں اللہ نے عطا کی تھیں اور انسانی نفوس کے کیا تجربات ان کو حاصل تھے، زندگی کے سرد وگرم کا انھیں

کس درجہ تجربہ تھا، جس کو یہ معلوم ہے؛ وہ بہ آسانی تمیز کرسکتا ہے کہ کون سا کلام ان کے شایانِ شان ہے اور کون سا نہیں، اوران باتوں کو بہ آسانی تمیز کرسکتا ہے جو ان کی جانب منسوب ہیں، انہی خطبات ورسائل میں سے جو واقعی انھیں کا کلام ہوسکتا ہے، ہم نے اپنی کتاب میں استشہاد کیا ہے، متعدد مستند ادبی مجموعات مثلاً ''الکامِل'' ازالمبرد، ''العِقدُ الفَرِید'' ازابن عبدربہ۔اور جاحظ کی ''البَیان وَالتَّبیین'' میں بھی یہ عبارتیں آئی ہیں۔
(المرتضیٰ ص:۲۸۸)

یہاں مصنف مدظلہ نے علامہ کی ہم آہنگی پر عمل کرکے دکھلا دیا کہ سند خواہ کیسی ہو؛ ذوق عربیت اوراس زمانہ کی زبان واسلوب سے واقفیت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کردیا کہ واقعی یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا کلام ہوسکتا ہے۔

قارئین کرام کو ہم تنقید کے پانچویں نمبر پر ''الکامل'' کی ایک عبارت دکھلا چکے ہیں، جس کو مصنف نے زبان واسلوب کی واقفیت کی بنیاد پر ''المرتضیٰ ص:۲۷۹'' میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا کلام سمجھ کر نقل کیا ہے کہ وہ عبارت مصنف کے اس بیان سے متعارض ہے جو بقول ان کے صحیح روایت ہے، مزید برآں مصنف کی ''صحیح روایت'' المرتضیٰ ص:۶۳ کی ایک عبارت سے بھی ٹکراتی ہے؛ کیوں کہ ان دونوں عبارتوں کا تقاضہ یہی ہے کہ بعثت نبوی کے وقت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی عمر پانچ سال سے کسی طرح زیادہ نہیں ہوسکتی، پس اس وقت ان کی عمر کو دس سال قرار دینا کس طرح صحیح روایت کے بہ موجب ہوسکتا ہے؟

دوسری ہم آہنگی

علامہ مودودی نے افتادہ پتھر میں ہیرے کی جوت دیکھ کر ایک منقطع السند حدیث کے لے لینے کا مشورہ دیا ہے، تو مصنف ''المرتضیٰ'' نے بھی ص:۱۷ میں اسی طرح ''الطبَقَات الکُبری'' کے ایک منقطع الاسناداثر قتادہ میں ہیرے کی جوت دیکھ کر فیصلہ

کردیا کہ جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے حامل (مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نہیں) علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔

تیسری ہم آہنگی

''سخنہائے گفتنی'' میں مصنف مدظلہ نے فن تاریخ کی مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''اس کی مثال ایک منہدم قصر کی ہے، جو کھنڈر کی شکل میں ہو، اس کے ملبہ کے نیچے وہ سب کچھ مل سکتا ہے؛ جس کی کسی طالب صادق اور جویائے حق کو ضرورت پڑسکتی ہے''۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''وہ شخص جو خود اس ملبہ کے نیچے دبے ہوئے اثاثہ کو تلاش نہیں کرتا؛ بلکہ دوسروں کے تلاش کردہ اثاثہ پر اعتماد کرتا ہے اور اس زمانہ کی تصویر دیکھنا چاہتا ہے؛ جب قصر آباد تھا، ہر شئی اپنی جگہ پر تھی، قصر جمال وشکوہ کا آئینہ دار تھا، وہ تاریخ کا حق ادا نہیں کرسکتا اور کھنڈر سے وہ جواہرات نہیں برآمد کرسکتا جن سے قصر کے نقش ونگار اور آرائش وجمال کا صحیح اندازہ ہوسکے''۔ (المرتضیٰ ص:۱۵)

یعنی اگلے محققین نے تاریخ کے جن اوراق کو جمع کیا اور روایات کو اسناد کے میزان پر تول کر قابل اخذ چیزوں کو لے لیا اور ساقط الاعتبار باتوں کو ساقط کردیا، جب تک ان گری پڑی چیزوں کو کوئی مورخ نہ اٹھالے، اگرچہ عرصہ دراز تک ویران رہنے والے قصر کے کھنڈرات میں کوڑا کباڑ پھینکتے وقت لوگوں نے دوسری چیزوں کو بھی ڈال دیا ہو؛ مگر یہ اٹھانے والا اس یقین کے ساتھ نہ اٹھالے کہ یہ سب اسی قصر شکستہ کے ملبہ اور اثاثہ ہیں جن سے قصر مزین تھا، وہ تاریخ کا حق ادا نہیں کرسکتا، حق تو وہی ادا کرسکتا ہے جو کسی منقطع الاسناد بات کو اور کسی الحاقی چیز کو جس سے عظمت رفتہ پر رنگ وروغن چڑھتا ہو لے لے اور اپنے ذوق کی بنیاد پر یقین کرلے کہ واقعی یہ اسی قصر کا اثاثہ ہے۔

مثلاً الشریف الرضی اور ابن ابی الحدید معتزلی شیعی راوی کی بیان کردہ مافوق العادۃ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعی کلام قرار دے دے، یا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خاندان کی منقصت بیان کردے، تو جو اس کو قبول کرے وہی تاریخ کا حق ادا کر رہا ہے:

اس کی مثال المرتضیٰ ص:۱۵۲ میں ابن ابی الحدید کی عبارت ملاحظہ فرمائیں، ہم اس فضول بات کو نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ

امام ولی اللہ دہلوی کی نصیحت

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''إِزَالَةُ الخفَاء عَنْ خِلافَةِ الخُلَفَاءِ'' ہے، اس کا بہترین اردو ترجمہ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے، جس کا نام ''کَشْفُ الغِطَاء عَنِ السُّنَّةِ البَيْضَاء'' ہے، اس میں امام دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل تنبیہ قائم کرکے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل تحریر فرمائے ہیں، اس کی ابتدا میں ہے:

تنبیہ سوم: باید دانست کہ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ یکے از اصحاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بود، وصاحب فضیلت جلیلہ در زمرۂ صحابہ رضوان اللہ علیہم، زنہار در حق او سوءِ ظن نہ کنی، ودر ورطۂ سبّ او نہ افتی تا مرتکب حرام نہ شوی۔

(ازالۃ الخفاء ص:۱۴۶، طبع ۱۳۹۶ھ، سہیل اکیڈمی، لاہور)

تیسری تنبیہ: جاننا چاہئے کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ ایک شخص تھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں اور زمرۂ صحابہ رضوان اللہ علیہم میں بڑے صاحب فضیلت تھے، تم کبھی ان کے حق میں بدگمانی نہ کرنا اور ان کی بدگوئی میں مبتلا نہ ہونا، ورنہ تم حرام کے مرتکب ہوگے۔ (ترجمہ امام اہل سنت ص:۳۱۶، مطبوعہ: لکھنؤ ۱۳۲۹ھ)

امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب قدس سرہ یہ ترجمہ کرنے کے بعد یوں تحریر فرماتے ہیں:

''مصنف نے بوجہ اس بحث کے ضمنی ہونے کے بنظر اختصار صرف پانچ فضیلتیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذکر فرمائی:

﴿۱﴾ ان کا صحابی ہونا۔ ﴿۲﴾ ان کے لیے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا فلاح دارین کی دعا مانگنا۔ ﴿۳﴾ دریا کے جہاد اول کی فضیلت میں ان کا داخل ہونا۔ ﴿۴﴾ ان کا کاتب جناب نبوت ہونا۔ ﴿۵﴾ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت کا ان کے دل میں جاگزیں ہونا۔

اس سے زیادہ فضائل معلوم کرنا چاہو تو کتاب "تَطْهِيْرُ الجِنَان" مؤلفہ ابن حجر مکی دیکھو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے سوءظن رکھنے والوں کی مختصر تفصیل

حضرت امام دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں بدگمانی کرنے سے منع فرمایا ہے، اس کی تشریح کرتے ہوئے امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں سوءِظن رکھنے والے تین گروہ ہیں:

اول: روافض، خیر ان کا سوءِظن چنداں جائے تعجب نہیں؛ کیوں کہ وہ ایسے مقدس حضرات سے سوءظن رکھتے ہیں جن کا مثل تمام امت مرحومہ میں ایک بھی نہیں۔

دوسرا گروہ: وہ ان جاہل صوفیوں کا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کا تکملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بدگوئی کو سمجھتے ہیں، یہ لوگ اپنے کو سنّی کہتے ہیں؛ مگر درحقیقت نہ صرف اس امر میں؛ بلکہ بہت سے امور اصول وفروع میں اہل سنت کے مخالف ہیں اور فرقہائے شیعہ میں داخل ہیں۔

تیسرا گروہ: اس زمانہ کے بعض اہل ظاہر کا ہے، بعض روایات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مطاعن ان کی نظر سے گزرے، اب بوجہ ظاہریت کے ا ن کی تاویل تک ان کے ذہن کی رسائی نہ ہوئی۔

ان سب میں زیادہ مضرت رساں دوسرا گروہ ہے، پھر تیسرا‘‘۔

مخلصانہ گذارش

اسی لئے عام مسلمانوں سے پرخلوص گذارش ہے کہ ’’المرتضیٰ‘‘ جیسی کتابوں میں جہاں اس قسم کی بحثیں آئیں، جن میں کسی بھی صحابی رسول کی شان میں عیب گیری ہو، اس وقت اپنی سلامتی کو مدنظر رکھ کر ان دونوں اماموں کے اس مضمون کو پڑھ کر اپنے ایمان کو تازہ کرلیں۔

اسی طرح محمود عباسی کی کتاب ’’معاویہ و یزید‘‘ جس میں خانوادۂ نبوت پر الزام آتا ہے، یا ’’خلافت وملوکیت‘‘ جیسی کتاب جو بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے سوءظن پیدا کرتی ہے، اگر کبھی اتفاق سے پڑھنی پڑ جائے تو اس آخری مضمون کو ضرور دیکھ لیں اور ’’حکایات صحابہ‘‘ کے خاتمہ کو ضرور پڑھ لیا کریں، جس کی نشاندہی ہم نے تنقید کے ’’ب ۹ کے ہ‘‘ میں کردی ہے، کہ آخرت میں ان اصحاب خیار رضی اللہ عنہم کے سامنے ذلت و رسوائی نہ ہو۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقُ، وَآخِرُ دَعْوَانَا أنِ الحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَلَمِيْنَ.

''حدیث افک'' پر

اعتراضات کے جوابات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

الحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفَى!

محرم الحرام ۱۴۰۷ھ کے دوسرے ہفتہ میں میرے دوعزیزوں (مولوی حافظ نعیم الدین اصلاحی، مولوی طاہر اعظمی، خریج جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ، مدرسین جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ) نے بتایا کہ:

''جناب شبیر احمد صاحب ازہر میرٹھی، سابق استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مقیم حال جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ نے حدیث افک کا انکار کیا ہے اور مراسیل زہری سے قرار دے کر اس کی تغلیط کی ہے''۔

موصوف سے میری ملاقات قصبہ سرائے میر، ضلع اعظم گڈھ میں اس وقت ہوئی تھی جب میں ''مدرسۃ الاصلاح'' میں حدیث پاک کی خدمت پر مامور تھا اور موصوف مسند احمد بن حنبل کے ایک مختصر حصہ کی شرح لکھ کر منظر عام پر لا رہے تھے، جس کی وجہ سے آپ کی علمی صلاحیت کا مجھے اندازہ تھا، تو عزیزان موصوف کو میں نے اجمالاً یہ بتادیا کہ حدیث افک کو صرف امام زہری رحمۃ اللہ علیہ ہی عروہ بن الزبیر سے نقل کرنے والے نہیں ہیں؛ بلکہ ہشام بن عروہ بھی اپنے والد محترم سے نقل کرتے ہیں، پس اس حدیث کو مراسیل زہری سے قرار دے کر صحت کا انکار قابل قبول نہیں۔

امام زہری اور ہشام بن عروہ دونوں کی جلالتِ شان محدثین کرام کے نزدیک مسلّم ہے، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمۂ صحیح مسلم میں لکھا ہے:

فَأَمَّا مَنْ تَرَاهُ يَعْمِدُ لِمِثْلِ الزُّهْرِيِّ فِيْ جَلالَتِهِ وَكَثْرَةِ أَصْحَابِهِ الحَفَّاظِ الـمُتْـقِنِيْـنَ لِـحَـدِيْثِـهِ وَحِـدِيْـثِ غَيْـرِهِ، أَوْ لِـمِثْلِ حَدِيْثِ هِشَـامِ بْنِ عُرْوَةَ، وَحَـدِيْثُهِـمَـا عِـنْـدَ أَهْـلِ العِلْمِ مَبْسُوْطٌ مُشْتَرِكٌ قَدْ نَقَلَ أَصْحَابُهُمَا عَنْهُمَا حَدِيْثَهُمَا عَلَى الاتِّفَاقِ مِنْهُمْ فِيْ أَكْثَرِهِ . (صحيح مسلم هندي ص:۵)

سو جسے تم دیکھو کہ ایسے شخص کا قصد کر رہا ہے جو زہری رحمۃ اللہ علیہ جیسا ہو ان کی جلالتِ شان میں اور ان کے ایسے تلامذہ کی کثرت میں جو سب حافظ حدیث ہیں اور زہری وغیرہ کی حدیث کو پختہ یاد کرنے والے ہیں، یا ہشام بن عروہ جیسے کی حدیث کا قصد کر رہا ہو کہ ان دونوں کی حدیثیں اہل علم کے نزدیک پھیلی ہوئی اور مشترک ہیں، ان دونوں سے ان کے اصحاب نے اس طرح نقل کیا ہے کہ وہ سب لوگ اکثر حدیثوں کے نقل کرنے میں متفق ہیں۔

پس یہ اگر دو جلیل القدر امام مجروح ہو جائیں، تو ذخیرۂ حدیث غیر مستند؛ بلکہ دو تہائی حدیثیں غیر معتمد ہو جائیں گی، اس طرح ذخیرۂ حدیث پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔

لیکن یہ اجمالی جواب ہے، پہلے اصل مضمون دیکھا جائے، اس کے بعد کوئی صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے، تو ان دونوں عزیزوں نے از ہر صاحب کی جدید تخلیق تفسیر سورۂ نور میرے پاس بھیج دی، اس کو دیکھنا شروع کیا تو دیباچہ میں یہ تحریر ملی:

مولانا شبیر احمد از ہر میرٹھی کی تفسیر سورۂ نور

”افک سے متعلق آیات کی تفسیر پھر اس کے ذیل میں حدیث افک کی تحقیق نئی چیز تھی، اہل علم و نظر کو چونکا دینے اور ان کے دل و دماغ کو اپیل کرنے والی“۔

پھر چار عالموں کے بارے میں لکھا ہے (جن میں دو فضلائے ندوۃ العلما لکھنؤ ہیں اور ایک فاضل دیوبند اور ایک فاضل مدرسۃ الاصلاح) کہ انھوں نے موصوف کی نئی تحقیق کو ملاحظہ فرمایا ہے اور ان میں سے تین صاحبوں نے اس کو بے حد پسند فرمایا، اس لئے میں نے بھی تفسیر میں سے خاص اس ”نئی تحقیق“ کا بنظر غائر مطالعہ کیا، مصنف کے

حسبِ توقع میں بھی چونک پڑا؛ لیکن الحمدللہ اس جدت طرازی سے میرے دل ودماغ متاثر ومسموم نہیں ہوئے؛ بلکہ ناقص عقلیت پسندی کی بنیاد پر صحیحین کی متفق علیہ حدیث کو رد کرنے کی بے جا کوشش سے مجھے انتہائی تکلیف پہنچی۔

حدیث افک میں مولانا میرٹھی کا مغالطہ

﴿۱﴾ ایسا محسوس ہوا کہ مصنف نے حدیث افک کی تحقیق میں نہ صرف دھوکہ کھایا ہے؛ بلکہ مغالطہ دینے کی بھی کوشش کی ہے، مثلاً:

ام رومان رضی اللہ عنہا کی حدیث کو رد کرتے وقت ان کی وفات کی تعیین میں صحیح قول کو ترک کر دیا ہے اور ضعیف روایت پر اپنی نئی تحقیق کی بنیاد قائم کی ہے اور اس بارے میں تفسیر ابن کثیر سے حدیث افک پر خطیب بغدادی کا اعتراض تو نقل کر دیا؛ جو قول ضعیف پر مبنی ہے اور پورے وثوق سے صحیحین کی اس حدیث کو گھڑی ہوئی قرار دے دیا؛ حالاں کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری شرح صحیح البخاری تفسیر سورۂ نور میں خطیب کا اعتراض اور اس کا جواب دونوں نقل کیا ہے، جو مصنف کی نظر سے یقیناً گزرا ہوگا؛ اس لئے لازم تھا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے جواب پر اپنی تنقید پیش کرتے، پھر جو چاہتے دعوی کرتے، مگر ایسا نہیں کیا اور مغالطہ دینے کے لئے اپنے سے پہلے اہل علم کی رائے کا توافق ظاہر کر دیا اور اس کی مدلل تردید کو مطلقاً ہاتھ نہ لگایا۔

صحیح بات یہ ہے کہ ام رومان رضی اللہ عنہا کا انتقال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہوا؛ اس لئے مسروق نے براہِ راست ان سے حدیثِ افک کو پوچھ کر نقل کیا ہے اور "سَألتُ أمّ رُوْمَانَ" کہنا بجا ہے، اس کو "سُئِلت أمّ رُوْمَانَ" بنا کر انقطاع کو ثابت کرنا محض قیاس آرائی ہے۔

اور خطیب نے جو ان کی وفات کا سال ۶ھ بتایا ہے؛ وہ غلط ہے؛ کیوں کہ اس کے بعد آیت تخییر نازل ہوئی، اس وقت ام رومان رضی اللہ عنہا باحیات تھیں، اسی

لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ''فَـلا عَلَيْكِ أَنْ لا تَعْجَلِيْ حَتّٰى تَسْتَأْمِرِيْ أَبَوَيْكِ''. (بخاری کتاب التفسیر ص:۷۰۵، وکتاب الطلاق ص:۷۹۲) (میں تم کو آیت تخییر سناتا ہوں، تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم جلد بازی نہ کرو، یہاں تک کہ اپنے باپ اور ماں سے مشورہ کرلو)۔

اور اگر بالفرض ''سَأَلت'' کو ایک جگہ ص:۴۷۹ میں ''سُئِلت'' بنادیا جائے، تو ص:۵۹۷ میں کون سی قیاس آرائی چلے گی، وہاں پر تو یوں ہے: ''عَنْ أَبِيْ وَائِلٍ قَالَ: حَدَّثَنِيْ مَسْرُوْقُ بْنُ الأَجْدَع قَالَ: حَدَّثَتْنِيْ أُمُّ رُوْمَانَ وَهِيَ أُمُّ عَائِشَةَ''؟

دوسرا مغالطہ

﴿۲﴾ اور جیسے ابواسامہ اور زہری کی حدیث کے درمیان تضاد دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''زہری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ان کے والدین اور ایک انصاری عورت کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر میں یہ آیات نازل ہوئی تھیں؛ لیکن ابواسامہ کی روایت میں ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والد کے یہاں پہنچیں، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں واپس جانے کی سخت تاکید کی، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں واپس آگئیں، دوسرے دن صبح کو ابوبکر وام رومان رضی اللہ عنہما دونوں ان کے یہاں پہنچ گئے، پس ابواسامہ کی روایت کے مطابق یہ آیات خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اتری تھیں''۔

اس مغالطہ کی توضیح کے لئے ہم پہلے دونوں سندوں کو پیش کرتے ہیں کہ دیکھئے یہاں پر تقابل زہری اور ابواسامہ کے درمیان نہیں ہے؛ بلکہ زہری اور ہشام کے درمیان ہے؛ مگر مفسر صاحب نے اس لئے ابواسامہ کا نام لیا ہے کہ اس روایت کو آسانی سے تعلیق قرار دے کر حدیث کی حیثیت کو کمزور کردیں، جیسا کہ بلا دلیل دوسری مسند روایت کو مراسیل زہری بتا کر رد کرنے کی کوشش بارہا کرچکے ہیں، ملاحظہ ہو:

﴿۱﴾ حَدَّثَنَا أَبُوْ الرَّبِيْعِ سُلَيْمَانُ بْنُ دَاوُدَ، حَدَّثَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ، عَنْ ابْنِ شِهَابِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عُرْوَةَ. (بخاري ص: ٣٦٣)

﴿۲﴾ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ، حَدَّثَنَا اللَّيْثُ، عَنْ يُوْنُسَ، عَنْ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ. (بخاري ص: ٦٩٦)

﴿۳﴾ .... قَالَ أَبُوْ أَسَامَةَ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ أَبِيْ، عَنْ عَائِشَةَ. (بخاري ص: ٦٩٩)

﴿٤﴾ حَدَّثَنَا مَحْمُوْدُ بْنُ غَيْلَانَ، ثَنَا أَبُوْ أَسَامَةَ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، قَالَ: أَخْبَرَنِيْ أَبِيْ، عَنْ عَائِشَةَ. (ترمذي/ تفسير/ سورة النور ١٤٨/٢)

﴿٥﴾ حَدَّثَنَا أَبُوْ الرَّبِيْعِ، حَدَّثَنَا فُلَيْحٌ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَائِشَةَ وَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ مِثْلَهُ. (بخاري ص: ٣٦٥)

مدارِ سند ہشام بن عروہ کے والد عروہ بن الزبیر ہیں، جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے واقعۂ افک کو نقل کرتے ہیں، اب پہلی اور دوسری سند میں عروہ کے شاگرد زہری ہیں اور تیسری، چوتھی اور پانچویں سند میں ان کے شاگرد خود ان کے لڑکے ہشام ہیں، تو انہی دونوں شاگردوں میں تقابل ہوگا، نہ کہ ہشام کے شاگرد ابو اسامہ اور عروہ کے شاگرد زہری کے درمیان۔

اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہشام کی تفصیلی روایت کو تعلیقاً ابو اسامہ سے نقل کیا ہے؛ لیکن امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو محمود بن غیلان کے واسطہ سے ابو اسامہ کے ساتھ متصل کر دیا ہے اور محمود بن غیلان امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے براہِ راست شیخ بھی ہیں، اس لئے یہ حدیث ان کی شرط پر ہوئی، چنانچہ ''بَابُ بُنْيَانِ الْكَعْبَةِ'' ص: ۵۴۰ وغیرہ میں محمود بن غیلان کی روایت موجود ہے، اگرچہ کسی مصلحت کی وجہ سے ہشام کی اس روایت کو تعلیقاً نقل کر دیا ہے؛ مگر ہشام کی تفصیلی روایت جس میں ابو اسامہ نہیں آتے، زہری کی اسی حدیث کے متصلاً نقل کرتے ہیں؛ مگر متن کو چوں کہ زہری کے الفاظ میں

ابھی بیان کرچکے ہیں (حدیث نمبرا میں)؛اس لئے صرف پوری سند متصل لاکر "مِثلَهُ" فرمادیا (حدیث نمبر۵ میں)۔

پھر پہلی اور پانچویں سند کو بغور دیکھئے کہ عروہ کے تلمیذ اول امام زہری اور تلمیذ ثانی ہشام بن عروہ دونوں ہی سے فلیح بن سلیمان روایت نقل کرتے ہیں اور دونوں سندیں متصل ہیں،لیکن ابواسامہ کی روایت کو بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیقاً نقل کیا ہے،مگر ترمذی کی تخریج نے اس کو علی شرط البخاری بنادیا اور ابواسامہ تنہا ہشام سے اس حدیث کی روایت کرنے والے نہیں ہوئے؛ بلکہ فلیح بن سلیمان بھی ان کے متابع موجود ہیں،جیسا کہ پانچویں سند کو ہم نے اوپر صحیح بخاری سے نقل کردیا۔

آیاتِ اِفک کہاں نازل ہوئیں؟

مصنف نے اپنی تحقیق نہیں پیش کی،صرف تضاد بیانی کو بنیاد بنا کر حدیث افک کی تغلیط کرتے ہوئے لکھا:

> "ہشام بن عروہ (اور بقول مصنف ابواسامہ) کی روایت کے مطابق خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اتری تھیں اور زہری کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر یہ آیات نازل ہوئی تھیں؛لہذا تضاد بیانی کی وجہ سے پوری حدیث ناقابل اعتبار ہے"۔

ہمارے نزدیک غلط فہمی کی بنا پر یہ بات مصنف لکھ گئے ہیں،مصنف کو دھوکہ یہاں سے ہوا کہ معاملہ کی تحقیق کرنے کی غرض سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر والدین کے گھر گئی ہیں،ام رومان نے ان کو تسلی دیتے ہوئے ان کی دل جمعی فرمائی ہے،یہاں تک مضمون دونوں حدیثوں میں ہے۔

اس کے بعد زہری کی روایت میں اختصار ہوگیا،جس کی وجہ سے واپسی کا ذکر نہیں؛ بلکہ دوسری باتیں مذکور ہیں،یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بطور خود

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تحقیق حال فرمانا اور ''ابواسامہ'' (بلکہ ہشام) کی روایت میں واپسی کا تذکرہ بھی ہے، پس ایک روایت یہاں واپسی کے ذکر سے ساکت ہے اور دوسری روایت میں اس کا بھی ذکر ہے؛ لہذا یہ تضاد بیانی نہیں ہوئی۔

تضاد بیانی تو اس وقت ہوتی جب زہری کی روایت میں گھر واپس آنے کا انکار ہوتا؛ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ جملہ خود زہری کی روایت میں بھی موجود ہے: **فَأَصْبَحَ عِنْدِيْ أَبَوَايَ .... فَبَيْنَا هُمَا جَالِسَانِ عِنْدِيْ وَأَنَا أَبْكِيْ، إِذْ اسْتَأْذَنَتْ اِمْرَأَةٌ مِنَ الأَنْصَارِ، فَأَذِنْتُ لَهَا، فَجَلَسَتْ تَبْكِي مَعِيْ، فَبَيْنَا نَحْنُ كَذٰلِكَ، إِذْ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَلَسَ.** (بخاري كتاب الشهادة ص:٣٦٥)

اور ''كتاب المغازي ص: ٥٩٥'' میں ہے: **وَأَصْبَحَ أَبَوَايَ عِنْدِيْ، وَقَدْ بَكَيْتُ لَيْلَتَيْنِ وَيَوْمًا ..... فَبَيْنَا أَبَوَايَ جَالِسَانِ عِنْدِيْ، وَأَنَا أَبْكِيْ، فَاسْتَأْذَنَتْ عَلَيَّ... إلخ.**

اور ''كتاب التفسير ص: ٦٩٧'' میں بھی زہری کی روایت بعینہ اسی طرح ہے، اس کا خلاصہ بھی وہی ہے جو ابواسامہ کی روایت کا خلاصہ ہے کہ ''دوسرے دن صبح کو ابوبکر اور ام رومان رضی اللہ عنہما دونوں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچ گئے''۔

پس زہری کی روایت کے مطابق بھی یہ آیات خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اتری تھیں، بخاری کی کسی بھی روایت میں یہ نہیں ہے کہ: ''**فَأَصْبَحْتُ عِنْدَ أَبَوَيَّ**'' میں نے اپنے ماں باپ کے گھر میں صبح کی؛ بلکہ میرے والدین میرے گھر صبح پہنچ گئے۔

اسی طرح زہری کے کسی طریق میں یہ بھی نہیں ہے کہ اگلے دن عصر کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں یہ آیتیں اتریں؛ البتہ حضرت ابوبکر، حضرت عائشہ، انصاریہ عورت، تینوں کے سامنے یہ آیتیں ضرور اتری ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں، ابواسامہ اور زہری کی تمام حدیثوں میں ہے۔

﴿ جَاؤُا بِالإِفْکِ ﴾ میں بنیادی بات

﴿۳﴾ ہم نے فاضل محقق کے دھوکہ کھانے اور مغالطہ دینے کی یہ دومثالیں پیش کردی ہیں، اس قسم کی باتیں پورے مضمون میں پھیلی ہوئی ہیں، اب ہم سورۂ نور کے بارے میں جو بنیادی بات ہے اس کو پیش کرتے ہیں، اگر چہ تفصیلی روایتوں میں بقول مصنف علت خفیہ بھی ہوتو مفسرین ومحدثین کے اجماعی فیصلہ اور بنیادی بات پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔

اوروہ بنیادی بات یہ ہے: " إِنَّ الَّـذِيْـنَ جَاؤُا بِالإِفْکِ عُصْبَةٌ " جملہ آیات ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت ثابت کرنے کے لئے اتری تھیں اوروہ متعین افک وبہتان جس کا ''بِـــالإِفْکِ'' معہود میں ذکر ہے، خاص ام المؤمنین کی ذات پاک پر ہی منافقین نے باندھا تھا؛ کیوں کہ اس کے بیان کرنے والے صرف زہری اور ابواسامہ ہی نہیں اور نہ اس کی روایت کرنے والی تنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات عالیہ ہے؛ بلکہ سات (۷) دوسرے صحابہ سے بھی یہ روایت کسی نہ کسی طرح مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھا گیا اوران کی براءت ظاہر کرنے کے لئے سورہ نور کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

امام فخر الدین رازی اور علامہ شوکانی کا دعویٰ اجماع
کہ آیات افک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اتریں

صاحب فتح القدیر (فی التفسیر) نے "إِنَّ الَّـذِيْنَ جَاؤُا بِالإِفْکِ " سے لے کر "وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ" تک کی تفسیر میں لکھا ہے:

أَجْـمَـعَ الـمُسْلِمُوْنَ عَلَى أَنَّ المُرَادَ بِمَا فِيْ الآيَةِ مَا وَقَعَ مِنَ الإِفْکِ عَلَى عَائِشَـةَ أُمِّ المُؤمِنِيْنَ (ج ٤ ص:١٢)

تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آیات میں جو افک کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ

بہتان ہے جو حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا پر پڑا تھا۔

اور تفسیر کبیر کے حوالہ سے ”صَفْوَةُ التَّفاسِیر ج:۲ص:۳۲۸“ میں بھی مسلمانوں کا اس پر اجماع نقل کیا ہے، اس اجماع کے بعد کوئی شخص ناقص عقلیت پسندی کے زعم میں سرے سے واقعہ ہی کا انکار محض ظن کی وجہ سے کر دے، پھر کوئی بھی اس کو تحقیق کا نام دے دے، تو وہ محض ستم ظریفی ہے، مزید تردید کی ضرورت نہیں ہے، پھر بھی ہم چند شواہد تبرعاً پیش کر دیتے ہیں:

دعویٰ اجماع کے شواہد

﴿**الف**﴾ حبر الامۃ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عیادت کرنے کے لئے تشریف لے جاتے ہیں، تو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَأَنْتِ بِخَيْرٍ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، زَوْجَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَمْ يَنْكِحْ بِكْرًا غَيْرَكِ، وَنَزَلَ عُذْرُكِ مِنَ السَّمَاءِ.

(بخاري/ تفسير/ سورة النور ص: ٦٩٩)

ان شاء اللہ آپ کے لئے خیریت ہی ہے، آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں، آپ کے سوا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کنواری عورت سے نکاح نہیں کیا اور آپ کا عذر آسمان سے اترا۔

اگر حضرت صدیقہ پر بہتان نہیں باندھا گیا تھا، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کر کے کس بات کو کہہ رہے ہیں؟ کہ ”آپ کا عذر آسمان سے اترا“۔

﴿**ب**﴾ **عَنِ ابْنِ أَبِي مُلَيْكَةَ عَنْ عَائِشَةَ كَانَتْ تَقْرَأُ: ﴿ إِذْ تَلِقُوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ ﴾، وَتَقُوْلُ: الوَلْقُ: الكِذْبُ. قَالَ ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ : وَكَانَتْ أَعْلَمَ مِنْ غَيْرِهَا بِذٰلِكَ، لأَنَّهُ نَزَلَ فِيْهَا.**

ابن ابی ملیکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا "إِذْ تَلَقَّوْنَهُ" کو "إِذْ تَلِقُوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ" پڑھتی تھیں اور کہتی تھیں کہ "وَلْق" کذب بیانی کو کہا جاتا ہے، یعنی تم لوگ اپنی زبانوں سے جھوٹی بات بول رہے تھے۔

یہ قرأت؛ قرأتِ شاذہ ہے، ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کو سب سے زیادہ جانتی تھیں؛ کیوں کہ انہی کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔

(صحیح بخاری/کتاب المغازی ج:۲،ص:۵۹۷ ہندی)

﴿ج﴾ صحیح بخاری تفسیر سورۂ احقاف میں بہ ذیل ﴿وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا﴾ متصل سند سے ایک واقعہ مذکور ہے اور اس سند میں نہ ہشام بن عروہ آئے ہیں نہ امام زہری۔

واقعہ یہ ہے کہ مروان جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حجاز کا گورنر تھا، اس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے بیٹے یزید کی بیعت خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں لینی چاہی تو عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی) نے اس حرکت پر نکیر کی، تو گورنر نے اپنے لوگوں سے کہا کہ اس کو گرفتار کرو! عبدالرحمٰن جلدی سے اپنی بہن ام المؤمنین کے گھر میں چھپ گئے، تو مروان کھسیا کر لوگوں سے کہنے لگا کہ عبدالرحمٰن وہ شخص ہے جو کفر کی وجہ سے اپنے ماں اور باپ کے لئے وبال بنا ہوا تھا، وہ دونوں خدا سے فریاد کر رہے تھے اور اسی کے بارے میں اللہ نے یہ آیت اتاری:

﴿وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا أَتَعِدَانِنِيْ﴾ الآية.

فَقَالَتْ عَائِشَةُ مِنْ وَرَاءِ الحِجَابِ: مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْنَا شَيْئًا مِنَ القُرْآنِ إِلَّا أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ عُذْرِيْ. (صحیح بخاری ص:۷۱۵)

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے سے بولیں: ہم اولادِ ابوبکر کے

بارے میں قرآن کی کوئی آیت اللہ نے نہیں اتاری، صرف میرے عذر کو نازل فرمایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت جس کو یوسف بن ماہک نے نقل کیا ہے (نہ زہری نے نہ ہی ابواسامہ نے) صریح ہے کہ واقعۂ افک جس کی صفائی اللہ نے نازل فرمائی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی متعلق ہے اور یوسف بن ماہک نے براہِ راست حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہے۔

﴿د﴾ جامع ترمذی ج۲ص:۱۴۹، ابوداؤد کتاب الحدود ص:۶۱۴ میں ہے:

أَنَّ ابْنَ أَبِيْ عَدِيٍّ حَدَّثَهُمْ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْحَاقَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِيْ بَكْرٍ عَنْ عَمْرَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَمَّا نَزَلَ عُذْرِيْ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَذَكَرَ ذٰلِكَ، وَتَلَا الْقُرْآنَ، فَلَمَّا نَزَلَ أَمَرَ بِرَجُلَيْنِ وَامْرَأَةً فَضُرِبُوْا حَدَّهُمْ، اهـ.

عمرہ بنت عبدالرحمٰن حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سے نقل کرتی ہیں کہ جب میرا عذر نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے، سو اس عذر کو بتایا اور قرآن کی تلاوت فرمائی، پھر جب منبر سے اترے تو دو مردوں اور ایک عورت کے بارے میں (حد لگانے کا) حکم فرمایا، سو ان سب کو ان کی حد لگائی گئی۔

(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ ص:۱۸۷)

اس روایت میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا "نَزَلَ عُذْرِيْ" میری صفائی نازل ہوئی صریح ہے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ہی بہتان تراشی ہوئی تھی، یہ حدیث حسن ہے، ابن اسحاق اس میں متفرد ہیں۔

مولانا میرٹھی کی تنقید امام بخاری کے مقابلہ میں

مصنف موصوف نے اس حدیث پر یوں تنقید کی ہے:

''رہی ان تینوں کو حد قذف لگنے کی بات ؛ تو یہ ابن اسحاق کی اناپ شناپ باتوں میں سے ایک ہے''۔

لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پورے وثوق کے ساتھ اس کو بجا و درست مانتے ہیں اور باوجودے کہ بخاری کی شرط کے موافق نہیں ہے، پھر بھی اس کو حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں، دیکھئے (صحیح بخاری، کتاب الاعتصام ص:۱۰۹۵)۔

وَشَاوَرَ عَلِيًّا وَأسَامَةَ فِيمَا رَمَى بِهِ أهْلُ الإفْكِ عَائِشَةَ، فَسَمِعَ مِنْهُمَا حَتَّى نَزَلَ القُرْآنُ، فَجَلَدَ الرَّامِينَ، وَلَمْ يَلْتَفِتْ إلَى تَنَازُعِهِمْ؛ وَلَكِنْ حَكَمَ بِمَا أمَرَهُ اللّٰهُ.

بہتان تراشوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو طوفان اٹھایا تھا، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما سے مشورہ لیا، ان دونوں کی رائے سنی، یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا، تو بہتان لگانے والوں کو حد لگائی اور ان کے جھگڑے کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور ہاں! خدا نے جو حکم دیا تھا اس کا فیصلہ کر ہی دیا۔

کیا اناپ شناپ باتوں کو اس قوت اور وثوق کے ساتھ دلیل میں پیش کیا جاتا ہے؟

پھر اگر ان دو مردوں اور ایک عورت کو حد قذف نہیں لگائی گئی، تو کسے لگائی گئی؟

تاریخ اور حدیث کے ذخیرے میں کسی اور کا نام ملتا ہے؟

اسلام تو عملی مذہب ہے، صرف نظریاتی تو نہیں ہے کہ حکم الٰہی حد قذف کا آئے اور اس پر عمل کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ دکھلائیں، جب کہ اس سے بڑے اور چھوٹے جرم پر عملاً حد جاری کر کے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھلا دیا۔

مثلاً حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اور غامدیہ رضی اللہ عنہا پر حدِ زنا لگنے کا بیان حدیث وفقہ کی کتابوں میں موجود ہے، فاطمہ مخزومیہ رضی اللہ عنہا پر حد سرقہ قائم کر کے عملاً نمونہ

دکھلا دیا گیا، عرینیین پر ارتداد اور قطع طریق کی حد لگائی گئی، نعیمان یا ابن النعیمان پر شرب خمر کی حد لگی، تو حد قذف کا صرف حکم ہی آیا؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں اس پر عمل نہیں کیا گیا؟ اور جن لوگوں نے عمل کی روایت نقل کی ان کی باتیں اناپ شناپ ہیں؟

﴿۴﴾ اب ہم ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں، جن کو "مفتاحُ القرآن" تفسیر سورۃ النور کے مصنف نے اس حدیث پر وارد کیا ہے، لکھتے ہیں:

"لیکن میں وثوق و یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ روایات قطعاً غلط ہیں، روایات کو پرکھنے کے جو اصول محدثین اور اہل علم کے نزدیک طے شدہ ہیں؛ ان کی رُو سے بھی ان روایات کو غلط کہنا پڑتا ہے۔ .... اولاً میں ان روایات پر نقدِ احادیث کے مسلّمہ اصول وضوابط کی روشنی میں بحث کروں گا، اس کے بعد ان روایات کے اصل مصنفین اور وجہ تصنیف پر روشنی ڈالوں گا"۔

پھر پچیس صفحات تک عقلی اشکالات وارد کرنے کے بعد ص: ۶۶ میں بزعم خود محدثین کے اصول اسناد کے مطابق ان احادیث کی جانچ شروع کی ہے۔

حدیث افک پر از ہر میرٹھی صاحب کا پہلا اعتراض

حدیث افک پر پہلا اعتراض یہ کرتے ہیں:

"ابن شہاب زہری کا بیان یہ ہے کہ میں نے یہ قصہ کچھ سعید بن المسیب سے سنا ہے اور کچھ عروہ بن الزبیر سے، کچھ علقمہ بن وقاص لیثی سے، کچھ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ سے...................... پس اس اسناد میں دو قصور ہیں:

اول یہ کہ راوی تو ثقہ ہیں اور زہری نے ان کا نام بتایا ہے کہ وہ فلاں اور فلاں چار اشخاص ہیں؛ لیکن ان میں سے کسی بھی راوی کی بیان کردہ بات زہری نے متعین طور پر نہیں بتائی، پس راوی معلوم ہے اور مروی مجہول، اور یہ ضعف کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔

دوسرا قصور یہ ہے کہ ان چاروں میں سے کسی راوی کی یہ تصریح مذکور نہیں کہ اس نے خود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سے یہ قصہ سنا تھا"۔(تفسیر سورۃ النور ص:۶۷)

یہ اعتراض نقد احادیث کے مسلمہ اصول کے خلاف ہے

معترض کی یہ دونوں باتیں "نقدِ احادیث کے مسلّمہ اصول" کے خلاف ہیں؛ اس لئے کہ عنعنہ والی روایتوں میں سماع کی تصریح وہاں تلاش کی جاتی ہے جہاں راوی مدلس ہو اور یہاں ثقات اربع میں سے کوئی راوی مدلس نہیں، پس "عن" کا صیغہ جو محتمل سماع ہے، اس کو بالاتفاق سماع ہی پر محمول کرنا ہوگا اور ان ثقات کا "عَنْ عَائِشَةَ" کہنا تمام محدثین کے نزدیک " أنَّ عَائِشَةَ حَدَّثَتْهُمْ" کے ہم پایہ ہے؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان سب کی ملاقات اور ان سب کا سماع ثابت شدہ مسلّمات میں سے ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ لفظ "سَمِعْتُ" میں سماع کی تصریح ہے اور یہاں "عَنْ عَائِشَةَ" میں سماع کا ظن غالب ہے، تو اخبار آحاد ویسے بھی ظنی ہی ہوا کرتی ہیں۔

اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ مزید ترقی کر کے یوں فرماتے ہیں:

"کسی روایت میں بعینہ "سَمِعْتُ" نہ بھی ہو؛ لیکن شیخ اور تلمیذ ایک ہی دور کے ہوں تو "عَنْ فُلان" کہنا سماع ہی پر محمول ہوگا، جب تک صراحتاً اس کا انکار کسی روایت میں منقول نہ ہو"۔

اور یہاں تو ثقات اربع کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دور میں ہونا کیا معنی، بہت ساری حدیثوں کو ان ثقات اربع کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صراحتاً سننا ثابت ہے۔

پس مصنف نے جن ثابت شدہ مسلمہ اصول کی روشنی میں حدیث پر کلام فرمایا ہے، وہ خود مصنف کے تصنیف کردہ اصول تو ہو سکتے ہیں؛ ائمۂ حدیث کے مسلمہ اصول

نہیں ہیں۔

اسی طرح ''راوی معلوم اور مروی مجہول'' کی اصطلاح بھی محض مغالطہ ہے، محدثین کرام اور ائمۂ اصول نے سبب ضعف میں اس کو نہیں شمار کیا ہے؛ بلکہ ان کی تصریح ہے کہ اس طرح چند حدیثوں کو جمع کر کے بیان کرنا بلا کراہت جائز ہے، دیکھئے اسی حدیث کی شرح میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَهَذَا الَّذِيْ ذَكَرَهُ الزُّهْرِيّ مِنْ جَمْعِهِ الحَدِيْثَ عَنْهُمْ جَائِزٌ لا مَنْعٌ مِنْهُ، وَلا كَرَاهَةَ فِيْهِ، لأَنَّهُ قَدْ بَيَّنَ أَنَّ بَعْضَ الحَدِيْثِ عَنْ بَعْضِهِمْ وَبَعْضَهُ عَنْ بَعْضِهِمْ، وَهٰؤُلاءِ الأَرْبَعَةُ أَئمَّةٌ حُفَّاظٌ ثِقَاتٌ، مِنْ أَجَلّ التَّابِعِيْنَ، فَإِذَا تَرَدَّدَتِ اللَّفْظَةُ مِنْ هَذَا الحَدِيْثِ بَيْنَ كَوْنِهَا عَنْ هَذَا أَوْ ذَاكَ جَازَ الاحْتِجَاجُ بِهَا، لأَنَّهُمَا ثِقَتَانِ، وَقَدْ اتَّفَقَ العُلَمَاءُ عَلٰى أَنَّهُ لَوْ قَالَ: حَدَّثَنِيْ زَيْدٌ أَوْ عَمْرٌو، وَهُمَا ثِقَتَانِ مَعْرُوْفَانِ بِالثِّقَةِ عِنْدَ المُخَاطَبِ، جَازَ الاحْتِجَاجُ بِهِ اهـ. (شرح مسلم/ كتاب التوبة ج:٢ ص:٣٦٤)

''یعنی زہری نے ان تمام راویوں کی حدیث کو جو ایک ساتھ جمع کر دیا ہے؛ یہ بجا و درست ہے، اس میں نہ کوئی خرابی ہے اور نہ ممانعت؛ کیوں کہ وہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ حدیث کا کچھ حصہ ان کے بعض سے مروی ہے اور کچھ حصہ دوسرے سے اور یہ چاروں ائمہ فن، حفاظ حدیث، ثقہ اور عظیم الشان تابعین کرام میں سے ہیں، تو جب کسی لفظ میں یہ تردد ہو کہ یہ لفظ اس ثقہ کا ہے یا اس ثقہ کا؛ تو یہ مضر نہیں اور اس کو حجت بنا سکتے ہیں؛ کیوں کہ دونوں معتبر شخص ہیں اور علما اس بات پر متفق ہیں کہ اگر محدث کہے کہ مجھ سے زید نے حدیث بیان کی ہے یا عمرو نے اور زید و عمرو دونوں ثقہ ہوں، مخاطب کے نزدیک دونوں کی ثقاہت مشہور ہو، تو اس کو حجت بنانا اور دلیل میں پیش کرنا صحیح ہے''۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی بات پوری ہوئی۔ (شرح مسلم، کتاب التوبۃ)

وہ جب تمام اہل علم کا اس کی حجیت پر اتفاق نقل کرتے ہیں، تو ''روایات کے پرکھنے کے جو اصول محدثین اور اہل علم کے نزدیک طے شدہ ہیں، ان کی رو سے'' حدیثِ افک بالکل صحیح ہے، ہاں مصنف نے جو ذہنی اصول ایجاد کئے ہیں ان کی رو سے یہ روایات غلط ہوں، تو وہ ذہنی اصول بجائے خود لغو ہیں، اہل علم پر کیوں تہمت رکھی جائے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم کے علاوہ اپنی ''تقریب'' میں بھی یہ بات مختصراً لکھی ہے اور اصول حدیث کی ایک دوسری مشہور و معتبر کتاب ''مقدمہ ابن صلاح'' میں بھی یہی بات ہے، جس کو امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں تحریر فرمایا ہے، امام ابن الصلاح، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی پہلے کے ہیں، ان کی وفات ۶۴۲ھ میں امام نووی سے چونتیس سال پہلے ہو چکی ہے، دیکھئے مقدمہ ابن صلاح، مطبوعہ بھنڈی بازار، بمبئی ۱۳۵۷ھ۔ (النوع السادس والعشرون فی صفة رواية الحديث ص: ۱۱۸)

اور حافظ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس کے جواز کو اجماعی مسئلہ بتایا ہے: ''أَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى قَبُوْلِهِ مِنْهُ وَالاحْتِيَاجُ بِهِ''۔ (عمدۃ/کتاب الشہادۃ ص: ۳۹۸)

ازہر صاحب کا دوسرا اعتراض

مصنف تفسیر سورۃ النور نے اس صحیح، مسند، متصل روایت پر دوسرا اعتراض یہ کیا ہے:

''فی الواقع یہ زہری کی مرسل یعنی منقطع روایت ہے اور زہری کی منقطع روایات ناقابل اعتماد ہوتی ہیں، پھر مراسیل زہری کے بارے میں اہل علم کے اقوال نقل فرمانے کے بعد حدیث کے مرسل ہونے پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس حدیث کو ذکر کیا ہے اس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

قَالَ عُرْوَةُ: أُخْبِرْتُ أَنَّهُ كَانَ يُشَاعُ وَيُتَحَدَّثُ بِهِ عِنْدَهُ، فَيُقَرِّرُهُ وَيَسْتَمِعُهُ وَيَسْتَوْشِيهِ، وَقَالَ عُرْوَةُ أَيْضًا: لَمْ يُسَمَّ مِنْ أَهْلِ الإِفْكِ

أيْضًا إلَّا حَسَّانُ بْنُ ثَابِتٍ وَمِسْطَحُ بْنُ أثَاثَةَ وَحَمْنَةُ بِنْتُ جَحْشٍ فِيْ نَاسٍ آخَرِيْنَ، لا عِلْمَ لِيْ بِهِمْ، غَيْرَ أنَّهُمْ عُصْبَةٌ، كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى، وَإنَّ كِبْرَ ذٰلِكَ يُقَالُ لَهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيِّ ابْنُ سَلُوْلٍ.

عروہ نے کہا: مجھے یہ بات بتائی گئی کہ راس المنافقین کے سامنے بہتان طرازی پھیلائی جاتی تو وہ اس کی تردید نہ کرتا اور دھیان سے سنتا اور دوسرے سے نکتہ چینی کرواتا (مگر خود نہ کہتا)۔ عروہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل افک میں سے حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش کے سوا کسی اور کا نام نہیں لیا گیا، دوسرے لوگوں کے زمرہ میں، جن کا مجھے کچھ علم نہیں، بجز اس کے کہ وہ ایک گروہ ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے۔

"أُخْبِرْتُ" کے معنی ہیں: مجھے خبر دی گئی، کس نے خبر دی؟ اس کا ذکر نہیں، "لَمْ يُسَمَّ مِنْ أهْلِ الإفْكِ، إلخ" کے معنی ہیں: افک والوں میں سے صرف تین شخصوں کا نام زد ذکر کیا گیا ہے، اب ظاہر ہے اگر عروہ نے قصۂ افک کو خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا ہوتا، تو "أخْبَرَتْنِيْ" کہتے، "أُخْبِرْتُ" نہ کہتے، اور "لَمْ تُسَمَّ" بصیغۂ مؤنث معروف کہتے اور "لَمْ يُسَمَّ" بصیغۂ مجہول نہ کہتے"۔

جواباً عرض

عرض یہ ہے کہ اس لمبی روایت میں سے جس بات کو لفظ "أُخْبِرْتُ" سے عروہ نے بتایا ہے وہ یقیناً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے براہِ راست مسموع نہیں ہے؛ لیکن اس سے پوری روایت کا مرسل ہونا ہرگز لازم نہیں آتا کہ پورے قصۂ افک کو مرسل سمجھا جائے؛ کیوں کہ پوری روایت میں جتنی باتوں کو عروہ نے یا ان کے بقیہ تین اصحاب نے بذات خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا اس کو زہری نے " سَمِعْتُ فُلانًا وَفُلانًا عَنْ عَائِشَةَ كُلُّهُمْ حَدَّثَنِيْ طَائِفَةٌ مِنْ حَدِيْثِهَا" کے لفظ سے ذکر کر دیا اور جس بات کو عروہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بذات خود نہیں سنا تھا؛ بلکہ کسی کے واسطہ

سے سنا تھا، اس کو "أخبرتُ" اور "لَمْ يُسَمَّ" (بصیغۂ مجہول) سے بیان کر کے مسند سے الگ کر دیا اور بقیہ تین صاحبوں کی مشترک حدیث سے بھی الگ کر دیا، یہ تو زہری یا عروہ کے احتیاط کی بات تھی، چنانچہ یہاں بھی مسند حصہ "وَكَانَ الَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَ الإفْكِ عُبْدُ اللّٰهِ بْنُ أبَيّ ابْنُ سَلُوْلٍ" ہے، اس کے بعد "قَالَ عُرْوَةُ" والا جملہ ہے اور کتاب التفسیر میں بھی سفیان ثوری کے طریق سے اتنا ہی جملہ مسند بیان کیا ہے: "عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَ الإفْكِ كانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أبَيّ"، ص:٦٩٦۔ اور "كتابُ الشَّهَادة"، میں بھی فلیح بن سلیمان کے طریق سے سیاقِ حدیث میں ہے: "وَكَانَ الَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَ الإفْكِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيّ ابْنُ سَلُوْلٍ"، ص:٣٦٤، مطلب یہ ہوا کہ تہمت تراشی کے بڑے حصہ کا ذمہ دار منافق عبداللہ بن ابی تھا، یہاں تک تو مسند ہے اور تمام طرق میں ہے؛ لیکن اس ذمہ داری کی کیا کیفیت تھی، وہ کیفیت عروہ کو براہِ راست حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نہیں پہنچی؛ اس لئے اس کو "أخبِرتُ" سے تعبیر کر دیا کہ مجھے یہ بات بتائی گئی کہ راس المنافقین اس بات کو لوگوں سے کہلواتا، سنتا، اس کے سامنے لوگ کہتے تو ان کی بات میں بات ملاتا؛ لیکن خود تہمت نہ لگاتا کہ جرم ثابت ہو سکے اور حد سے وہ خود بچا رہ جائے، جیسا کہ یہی بعد میں ہوا اور حد قذف سے وہ خود بچ گیا اور با اخلاص مومنین میں سے کچھ مجرم ثابت ہو گئے اور ان پر حد لگا دی گئی۔

ان تمام تفصیلات سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ زہری نے غایت احتیاط سے مسند کو مرسل سے الگ کر دیا، پس اتنے حصہ کو خواہ نا قابل اعتماد کہہ لو؛ مگر بقیہ پوری حدیث کو مسند اور متصل سے خارج کرنا اور مرسل الزہری بتا کر شِبْهُ الرِّيح اور شَرُّ المَرَاسِيل کا حکم لگانا کسی طرح محدثین کرام کے اس اصول کے مطابق نہیں ہے جو کہ انھوں نے نقد احادیث کے سلسلہ میں بیان کیا ہے اور اس احتیاط کو مصنف کا اپنے باطل مزعومہ کی تائید میں پیش کرنا حیرت کی بات ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بقیہ شبہات

مصنف نے اصول حدیث کے لحاظ سے یہی دو اعتراضات کئے ہیں، جن کے جواب سے ہم فارغ ہوگئے، ان کے علاوہ کچھ شبہات ذکر کئے ہیں، جن میں سے بعض شبہوں کا قلع قمع خود الفاظ حدیث ہی سے ہوجاتا ہے اور کچھ ناقص عقلیت پسندی کا نتیجہ ہیں، البتہ دو شبہے کچھ وقیع ہیں اور شراح حدیث اس کو پہلے ذکر کر کے جواب دے چکے ہیں، کچھ مصنف محترم کی وسیع النظری کا کرشمہ نہیں ہے، اس لئے ہم انہی دونوں شبہوں کو اصالۃً بیان کرتے ہیں:

پہلا شبہہ:

یہ ہے کہ واقعۂ افک کے وقت حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں، ان کے نکاح کے بعد ہی متصلاً آیت حجاب نازل ہوئی ہے اور بقول مصنف علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ غزوۂ احزاب یعنی خندق جو ۵ھ میں ہوا؛ اس کے بعد ہی یہ ام المؤمنین بنی ہیں، تو اگر غزوۂ بنی المصطلق کو خندق سے پہلے مانا جائے تو حضرت زینب اس وقت ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمرہ میں شامل ہی نہیں ہوئی تھیں، تو کس طرح انھوں نے اس معاملہ میں رائے دی اور ان کی بہن کس طرح ان کی مدد میں واقعۂ افک میں شریک ہوئیں؟ اور اگر خندق کے بعد مانا جائے، تو یہ بالیقین ثابت ہے کہ خندق سے فارغ ہوتے ہی یہود بنی قریظہ کو سزا دی گئی اور اس کے متصلاً بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی، اس کے بعد غزوۂ بنی المصطلق میں واقعۂ افک پیش آیا اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اس میں رائے دی ہے اور عبداللہ بن ابی منافق کو گردن زدنی قرار دیا ہے، جب کہ اس سے پہلے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فوت ہو چکے تھے، تو کیسے انھوں نے رائے دی؟

جواب:

اس شبہہ کی بنیاد نکاح زینب ام المؤمنین کو غزوۂ خندق سے مربوط بنانے پر ہے، ورنہ ۵ھ کے شعبان میں غزوۂ مریسیع کو مانا جائے اور غزوۂ خندق کو شوال ۵ھ کے آخر سے ذوالقعدہ ۵ھ تک برقرار رکھا جائے، تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی گفتگو بلا شبہہ ثابت ہو جاتی ہے؛ کیوں کہ مریسیع اور واقعۂ افک کے بعد غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی رگِ اکحل میں تیر لگا ہے اور بنی قریظہ کا فیصلہ کرنے کے بعد فوت ہوئے ہیں اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی ۵ھ میں مانا جائے تو شعبان سے پہلے ہی ۵ھ کے کسی مہینہ میں زمرۂ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل تھیں، چنانچہ حافظ ابوعمر بن عبدالبر "الاستیعاب" میں لکھتے ہیں:

١٣٠- زَيْنَبُ بِنْتُ جَحْشٍ زَوْجُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأُمُّهَا أُمَيْمَةُ بِنْتُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ.

زوجۂ پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زینب بنت جحش کی والدہ عبدالمطلب کی صاحب زادی امیمہ ہیں۔

تَزَوَّجَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ سَنَةِ خَمْسٍ مِنَ الْهِجْرَةِ، هَذَا قَوْلُ قَتَادَةَ، وَقَالَ أَبُوْ عُبَيْدَةَ: تَزَوَّجَهَا فِيْ سَنَةِ ثَلاثٍ مِنَ التَّارِيْخِ. (ص: ٧٣٣)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۵ھ میں ان سے نکاح کیا، یہ قتادہ کا قول ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا کہ ۳ھ میں ان کا نکاح ہوا۔

پس ۳ھ والے قول کی بنیاد پر جس طرح زینب رضی اللہ عنہا واقعۂ افک کے موقع پر سلسلۂ ازواج میں داخل ہیں اور انھوں نے رائے دی ہے، اسی طرح واقعۂ افک، پردہ نازل ہونے کے بعد ہی واقع ہوتا ہے، اس طرح یہ شبہہ ختم ہو جاتا ہے، الغرض نکاح زینب سے صرف حکم حجاب مربوط ہے نہ کہ غزوۂ احزاب۔

موسیٰ بن عقبہ نے بھی یہی کہا ہے کہ غزوۂ مریسیع اور غزوۂ خندق دونوں ایک سال میں ہیں، اس لئے علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو تمام مورخین کی رائے کے خلاف بتانا صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے مریسیع کو پہلے اور خندق کو بعد میں بتایا؛ کیوں کہ شعبان پہلے آتا ہے اور شوال وذوالقعدہ بعد میں۔

دوسرا شبہہ:

واقعۂ افک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ طلب کرنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دیا ہے:'' سَلِ الجَارِيَةَ تُصَدِّقُکَ''، باندی سے پوچھئے وہ آپ کو سچی بات بتائے گی، اس کے بعد بعض طرق میں ''فَدَعَا الجَارِيَةَ'' کا لفظ ہے، جاریہ کو بلایا، کس جاریہ کو؟ یہ مذکور نہیں؛ لیکن اکثر طرق میں جاریہ کو نامزد ذکر کیا گیا ہے: فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَرِيْرَةَ فَقَالَ: أيْ بَرِيْرَةُ! هَلْ رَأيْتِ مِنْ أمْرٍ يُرِيْبُکِ؟ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (جاریہ) بریرہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور پوچھا کہ اے بریرہ! کیا تم نے کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو تمہیں شبہہ میں ڈال دے؟ اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مملوکہ فتح مکہ کے بعد ہوئی ہیں؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو جب خرید کر آزاد کردیا تو ان کو فسخ نکاح کا حق ملا اور وہ شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہوئیں اور ان کے شوہر مغیث رو رو کر مناتے رہے، پھر بھی وہ تیار نہیں ہوئیں، محبت ونفرت کی کشمکش کو دیکھ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اس حیرت انگیز منظر کو ذکر کیا۔

اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں فتح مکہ کے بعد قیام پذیر ہوئے ہیں، تو اس کے پہلے غزوۂ مریسیع (بنی المصطلق) جس میں واقعۂ افک پیش آیا، اس میں حضرت بریرہ کو بلانے اور سوال وجواب کرنے کا ذکر کیسے آیا۔

جواب:

یہ حضرت بریرہ اگر وہی ہیں جن کے بدلِ کتابت کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فتح مکہ کے بعد ادا کر کے آزاد کیا تھا، تو وہ بنو ہلال کی مرقوقہ تھیں، ممکن ہے حالتِ رِقّیت کے زمانہ میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت مفت یا اجرت پر کرتی رہی ہوں اور ان کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس دورِ غلامی میں آنے جانے کا ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ جب ان کے اہلِ خانہ نے ۹ اوقیہ کے بدلے مکاتب بنایا تو اس خطیر رقم میں تعاون حاصل کرنے کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں۔

جَاءَ تْ بَرِيْرَةُ تَسْتَعِيْنُهَا فِيْ كِتَابَتِهَا. (صحيح البخاري ج:١ ص:٣٤٨)

اور آدمی تعاون اسی سے طلب کرتا ہے جس سے تعلقات شگفتہ ہوتے ہیں، اس لئے گھر میں آنے جانے کی وجہ سے ان سے تحقیق حال کیا گیا ہو تو کوئی استبعاد نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی دوسری جاریہ ہوں، جن کا نام بھی اتفاق سے بریرہ ہی رہا ہو۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں فرماتے ہیں:

وَقَد أَجَابَ غَيْرُهُ: بِأَنَّهَا كَانَتْ تَخْدُمُ عَائِشَةَ بِالأُجْرَةِ، وَهِيَ فِيْ رِقِّ مَوَالِيْهَا قَبْلَ وُقُوْعِ قِصَّتِهَا فِيْ الْمُكَاتَبَةِ، وَهَذَا أَوْلَى مِنْ دَعْوَى الإِدْرَاجِ وَتَغْلِيْطِ الحُفَّاظِ. (تفسير سورة النور، شرح بخاري ج:٨ ص: ٤٦٩)

ابن قیم حنبلی کے علاوہ دوسروں نے یہ جواب دیا ہے کہ بریرہ رضی اللہ عنہا مزدوری پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس وقت خدمت کرتی تھیں جب اپنے آقاؤں کی ملکیت میں تھیں اور ان کی مکاتبت کا قصہ ابھی پیش ہی نہیں آیا تھا اور حفاظ کی جانب غلط بیانی کی نسبت کرنے اور بریرہ کے نام کو مدرج ٹھہرانے سے زیادہ بہتر یہی ہے۔

امام بدرالدین الزرکشی متوفی رجب ۷۹۴ھ اپنی مشہور کتاب "**الإِجَابَةُ لا يُرَادُ مَا اسْتَدْرَكَتْهُ عَائِشَةُ عَلَى الصَّحَابَةِ**"، کے صفحہ ۴۳، مطبوعہ بیروت ۱۹۸۰ھ، پر حدیثِ افک پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فَهٰذِهِ ثَلاثَةُ أَوْهَامٍ أُدُّعِيَتْ فِيْ حَدِيْثِ الإفْكِ، وَهْمٌ فِيْ بَرِيْرَةَ، وَوَهْمٌ فِيْ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ، وَوَهْمُ فِيْ أُمِّ رُوْمَانَ، وَالثَّلاثَةُ ثَابِتَةٌ فِيْ الصَّحِيْحِ، فَلا يَنْبَغِيْ الاقْدَامُ عَلَى التَّوْهِيْمِ إِلَّا بِأَمْرٍ بَيِّنٍ، وَقَدْ تَقَدَّمَ مَا يَدْفَعُ الكُلَّ.

پس یہ تین اوہام ہیں، جن کا حدیثِ افک میں دعوی کیا گیا ہے: ایک بریرہ کا ذکر، دوسرا سعد بن معاذ کا تذکرہ، تیسرا ام رومان کا ذکر اور تینوں الجامع الصحیح میں ثابت شدہ ہیں؛ اس لئے بغیر واضح دلیل کے وہم قرار دینے پر پیش قدمی نہ کی جائے اور تینوں اوہام کو دفع کرنے کی تفصیل گزر چکی۔ (الاجابۃ ص:۴۳)

تو جس طرح مصنف نے بعض اوہام میں اپنے سے پہلے لوگوں کی ہمنوائی کی ہے، اسی طرح جواب بھی ہم سے پہلے بعض محققین دے کر فارغ ہو چکے ہیں۔

قلّتِ تدبر:

مصنف کے بہت سے شبہات قلّتِ تدبر کا نتیجہ ہیں، اگر اس حدیث کو بنظرِ غائر احقاقِ حق کے لئے دیکھے ہوتے، تو وہ شبہات نہ واقع ہوتے، مثلاً ''مشورہ کے لئے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو کیوں منتخب کیا، جب کہ وہ نوعمر لڑکے تھے اور حضرت زید رضی اللہ عنہ ان کے والد موجود تھے، کہیں لڑکوں سے ایسی اہم بات میں مشورہ لیا جاتا ہے''۔ اگر اس مشورہ کو تحقیق حال سمجھے ہوتے تو شبہہ نہ پیدا ہوتا؛ کیوں کہ گھریلو حالات کی تحقیقی بات بلاخوف وخطر وہ نوجوان ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے، جو بچپن سے گھر میں آتا جاتا ہو، بقول مصنف حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس واقعہ کے وقت پندرہ سال کے تھے اور تحقیقی بات یہ ہے کہ آیتِ حجاب دو سال پہلے نازل ہو چکی ہے، تو اس کے پہلے تین سال تک جو سمجھ دار لڑکا گھر میں آتا جاتا رہا ہو، شک وشبہہ کی باتیں اس کو جس قدر معلوم ہوں گی دوسرے لوگوں کو وہ بات نہیں معلوم ہو سکتی۔

اسی طرح ناتجربہ کاری کی باتیں ''وَأَنَا جَارِيَةٌ حَدِيْثَةُ السِّنّ''، ''میں نوعمر لڑکی تھی''، پر غور کئے ہوتے تو شبہہ نہ پڑتا، ہودج تنہا ایک آدمی نہیں باندھتا تھا؛ بلکہ وہ بہت

سے لوگ مل کر اٹھاتے تھے؛ اسی لئے ان کو ہودج کے خالی ہونے کا شبہہ نہ ہوا، اس کو خلافِ عقل قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے، ایسے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تنہا قضائے حاجت کے لئے جانے پر شبہہ بھی بے بنیاد ہے، ''بیچ لشکر سے کوئی عورت جائے اور پورے لشکر کو خبر نہ ہو'' یہ بھی غور کی کمی کا نتیجہ ہے، قضائے حاجت کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گئیں؛ پھر پڑاؤ پر واپس آئیں، تو ہار کے گم ہونے کا علم ہوا، پھر دوبارہ ہار تلاش کرنے گئیں، اس کے بعد قافلہ روانہ ہو گیا، جب سارا لشکر جاگ رہا تھا اور سب لوگ روانگی کے لئے اپنی اپنی تیاری میں لگے ہوئے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اگر جاتے بھی دیکھے ہوں اور واپس آتے بھی دیکھے ہوں؛ مگر ان کے دوبارہ ہار تلاش کرنے کے لئے جانے کو وہ لوگ کیا جانتے ہیں، جو خود جانے کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔

مصنف کو دھوکہ یہ ہو گیا ہے کہ قضائے حاجت سے واپس آتے ہوئے راستہ ہی میں ہار کی گم شدگی کا علم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہو گیا، تو وہ وہیں سے واپس ہار ڈھونڈنے چلی گئیں، حالاں کہ حدیث میں صاف موجود ہے:

فَلَمَّا قَضَيْتُ شَأْنِيْ، أَقْبَلْتُ إِلَى الرَّحْلِ، فَلَمَسْتُ صَدْرِيْ فَإِذَا عِقْدٌ، إلخ.

جب ضرورت پوری کر چکی تو میں پڑاؤ پر آ گئی، تب میں نے سینہ چھوا تو ہار ندارد تھا۔

أَقْبَلْتُ إِلَى الرَّحْلِ کا ترجمہ حافظ نے یوں کیا ہے: رَجَعْتُ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِيْ كَانَتْ نَازِلَةً فِيْهِ ،جس جگہ اتری تھیں وہیں واپس آ گئیں، تب سینہ چھوا۔ (ج ۸ ص: ۴۵۹)

قلّتِ تدبر سے یہ شبہہ بھی مصنف کو پڑ گیا کہ وسط شعبان سے وسطِ رمضان تک وحی کا نازل نہ ہونا احادیثِ صحیحہ کے خلاف ہے؛ کیوں کہ رمضان کی ہر شب میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہ مہینہ بھر مطلق وحی آنے کا انکار کیا ہے اور نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ملاقات کا انکار کیا ہے؛ بلکہ یہ فرمایا کہ اس خاص معاملہ میں وحی نازل نہیں ہوئی اور ایک

مہینہ تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وحی کا انتظار رہا اور جبرئیل امین کوئی بات خود کیسے بتائیں گے، جب تک اللہ تعالی کی طرف سے پیغام نہ ملے، بخاری شریف کے ان الفاظ پر غور کیجئے: وَقَدْ مَكَثَ شَهْرًا لا يُوحَى إِلَيْهِ فِي شَأْنِي شَيْءٌ.

(بخاری ص:٣٦٥، ٥٩٦، ٦٩٧)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینہ اس حال میں رُکے رہے کہ میرے بارہ میں کوئی وحی نازل نہیں ہو رہی تھی۔

پورے مضمون میں بہت سی باتیں محض دعوی اور ذہنی اپج ہیں، اس پر کوئی دلیل مصنف کے پاس بھی نہیں ہے، مثلاً ''افک سے پہلے اللہ تعالی نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ جو لوگ پارسا عورتوں پر الزام لگائیں اور ثبوت نہ پیش کریں، تو ان کو اسی کوڑے لگاؤ''۔ اس پر کیا دلیل ہے؟ ہاں! اس کے خلاف پر دلیل قائم ہے، جس کو ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ سے ہم نقل کر چکے ہیں کہ آیت اترنے پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے، آیتوں کی تلاوت فرمائی، پھر تین شخصوں کو حد لگوائی، جس سے ثابت ہوا کہ افک کا واقعہ پیش آنے کے بعد یہ قانونِ خداوندی نازل ہوا۔

یا جیسے فلسفیانہ انداز میں واقعۂ افک کو خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کے منافی قرار دیا ہے، کیا تہمت لگانے والوں کو حد لگ جانے اور ان کے جھوٹے ہونے کے مشتہر ہو جانے کے بعد، اسی طرح حرم پاک کی صفائی میں قرآن کریم کی آیتوں کے اتر جانے کے بعد بھی عصمتِ نبی محفوظ نہیں رہی؟

درحقیقت یہ ایک عظیم الشان ابتلا تھا، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا اور خاندانِ ابوبکر کو پیش آیا؛ کیوں کہ ''كَذَلِكَ الرُّسُلُ تُبْلَى، وَتَكُونُ لَهُمُ العَاقِبَةُ'' (بخاری، کتاب التفسیر ص:۶۵۳و۴۱۳)۔ اور ''أَشَدُّ النَّاسِ بَلاءً الأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الأَمْثَلُ فَالأَمْثَلُ'' اور ''لَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يُؤْذَى أَحَدٌ'' وغیرہ حدیثوں سے بخوبی ثابت ہے، جس سے کامل الایمان کے اخروی درجات میں اضافہ وترقی کرانی مقصود ہوتی ہے۔

ناظرینِ کرام سے ہم درخواست کرتے ہیں کہ خاص اسی حیثیت سے اگر اس واقعہ کو دیکھنا چاہیں تو علامہ ابن قیم کی ''زَادُ المَعَاد'' میں غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک اور اس کی حکمتوں کو ملاحظہ فرمائیں، ان شاءاللہ یہ سب عقلی شبہات کافور ہو جائیں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَلَمِيْنَ.

باسمہ سبحانہ

حیاتِ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

پس منظر

محترم جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری کی تصنیف ''حیاتِ امام اعظم ابوحنیفہ'' پر تقریباً دس سال پہلے ایک تبصرہ کیا گیا تھا، جسے خود مصنف نے بنظرِ استحسان دیکھا اور جوابی خط میں کھلے دل سے اعتراف کیا، جیسا کہ اہلِ علم کی شان ہوتی ہے، موصوف لکھتے ہیں کہ

''امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر آپ کا قیمتی تبصرہ پڑھا، شکر گزار ہوں، اب آئندہ ایڈیشن میں اس حیثیت کو سامنے رکھ کر لکھوں گا، تبصرہ میں سے بعض باتوں سے مجھے اتفاق ہے اور آپ کی بعض باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں، ممکن ہے کہ آئندہ مراجعت کتب پر میں ان سے بھی متفق ہو جاؤں، تاہم آپ کا تبصرہ قیمتی اور مشورہ قابلِ قدر ہے''۔

ایک حق پسند مصنف کے اس اعتراف کے بعد اس تبصرہ کی اشاعت کی قطعاً ضرورت نہیں تھی؛ لیکن اس خیال سے کہ پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کی تصحیح ہو جائے گی اور ایک حق پرست کی علمی جلالت بھی قارئین کے سامنے آجائے گی، اسے بھی شائع کیا جارہا ہے''۔

زین العابدین

باسمہ سبحانہ

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

حالاتِ زندگی، قانون سازی اور فقہ

ازقلم: مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری، مدظلہم العالی۔

ملنے کا پتہ: مدنی دار التالیف، بجنور

قیمت: بیس روپے

اس قیمتی تالیف پر اکابرین علما اور اصحاب قلم کی تقریظات کتاب کے اندر ہیں، ان میں سے اکثر تبصرہ نگاروں نے لائق مؤلف کی محنت کو خوب خوب سراہا ہے اور تالیف کو بجا طور پر دادِ تحسین دی ہے، مجموعی اعتبار سے کتاب قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے۔

ان اکابرین کے تعریفی کلمات کے بعد مزید تبصرہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی؛ لیکن فاضل مؤلف نے مقدمہ میں یہ لکھا ہے کہ:

> ”اہل علم اور قدرداں حضرات کا ہمیشہ سے یہی طریقہ رہا ہے کہ انھوں نے جہاں کسی لغزش پر اطلاع پائی ہے، مطلع کیا ہے، یہی آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت میری ضعیف ترین انسانیت کو جو خطا ونسیان سے مرکب ہے، فراموش نہ فرمائیں“۔

اس لئے چند باتیں جو میرے خیال میں فاضل مؤلف کی چوک ہیں، تحریر کرتا ہوں، تاکہ آئندہ ایڈیشنوں میں اگر تصحیح کرنا چاہیں تو کرسکیں۔

کچھ فروگذاشتیں

﴿الف﴾ صفحہ ۵۹ پر امام صاحب کے اساتذۂ حدیث کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بعض حضرات نے امام صاحب کے اساتذہ کی تعداد ۹۹ بتلائی ہے اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۰۹ تعداد بتلائی ہے، ہم نے نہایت تحقیق کے بعد آپ کے اساتذہ کی مندرجہ ذیل فہرست تیار کی ہے''۔

اس کے بعد ''تَنسِیق النّظام'' کی فہرست مضامین میں سے ''اسماءِ شیوخ الامام بلا واسطہ'' کی فہرست بعینہ نقل کی ہے، جس کا پس منظر یہ ہے کہ مولانا اسرائیلی علیہ الرحمہ نے حروف تہجی کے مطابق پہلے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے حالاتِ زندگی، پھر امام صاحب کے اساتذہ بلا واسطہ کے تفصیلی حالات، پھر بالواسطہ استادوں کے تفصیلی حالات تحریر فرمائے ہیں اور ہر باب میں ''الکنٰی'' کے عنوان سے عام کتب رجال کے طرز پر مبہماتِ مذکورہ کی تعیین اور غیر مذکورین کے مزید حالات کو قلم بند فرمایا ہے، پھر سہولت کے پیشِ نظر فہرست ہر سہ ابواب آخر میں لگا دی ہے، مؤلف محترم نے بیچ والی فہرست کو نقل کیا ہے؛ لیکن اس باب کی تمام کنیتوں کو مستقل افراد سمجھ کر نمبر شمار اس طرح لگا دیا کہ جن بزرگوں کو اسماء کے ذیل میں شمار کر آئے تھے، ان کی کنیتوں کو بھی مستقل شمار کر لیا، ہمارے نزدیک مناسب یہ تھا کہ خط کشیدہ کلمات کی جگہ کچھ اس قسم کے الفاظ ہوتے کہ ''حضرت مولانا محمد حسن اسرائیلی سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسند امام اعظم کے مقدمہ ''تنسیق النّظام'' کے اندر امام صاحب کے اساتذہ کی درج ذیل فہرست مرتب کی ہے''، پھر فہرست نقل کر کے مکررات کو واضح کر دیا جاتا اور جس طرح شروع باب میں حوالہ جات کے تحت ''تنسیق النظام'' کا حوالہ ہے، یہاں بھی آ جاتا تو ''ادعا'' کا شائبہ نہ رہتا، جو فاضل مؤلف جیسے متواضع و منکسر المزاج کے شایانِ شان ہوتا۔

مؤلف موصوف نے جن مکررات کی نشاندہی نہیں کی، ہم (۱۱۲) میں سے ان کی نشاندہی موصوف کے نمبرات کے ساتھ کئے دیتے ہیں۔

نمبر	مکرر کنیتیں مع نمبرات مؤلف	اسماء مذکورین مع نمبرات مذکورہ	مرجع وحوالہ جات
۱	ابواسحاق السبیعی (۹۶)	عمرو بن عبداللہ الہمدانی (۵۶)	میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب، تنسیق النظام
۲	ابوبردہ (۹۷)	عامر بن ابی موسیٰ بن قیس الاشعری (۲۶)	نووی شرح مسلم، تنسیق النظام
۳	ابوحصین (۹۹)	عثمان بن عاصم (۴۵)	تنسیق النظام
۴	ابوالزبیر (المکی) (۱۰۰)	محمد بن مسلم بن تدرس (۱۹)	نووی شرح مسلم، تنسیق النظام
۵	ابوسفیان (السعدی) (۱۰۱)	طریف بن شہاب (۳۱)	میزان الاعتدال، تنسیق النظام
۶	ابوسفیان (۱۰۲)	طلحہ بن نافع الواسطی (۳۲)	میزان الاعتدال، نووی شرح مسلم، تنسیق النظام
۷	ابوعمر (۱۰۵)	ذر بن عبداللہ (۱۷)	تراجم الاحبار، تنسیق النظام
۸	ابن شہاب الزہری (۱۰۶)	محمد بن مسلم بن عبیداللہ (۷۰)	حاشیہ موطا امام محمد، نووی، تنسیق النظام
۹	ابوفروہ (۱۰۸)	مسلم بن سالم النہدی (۷۴)	تنسیق النظام
۱۰	ابوکثیر (۱۰۹)	یزید بن عبدالرحمٰن السحیمی (۹۳)	تنسیق النظام
۱۱	ابویعفور (۱۱۲)	وقدان، وقیل: اسمہ واقد (۸۶)	ترمذی/ابواب الاطعمہ، تنسیق النظام

ان گیارہ مکرر ناموں کے حذف کردینے کے بعد صرف ایک سو ایک (۱۰۱) شیوخ باقی رہے، ان میں سے محمد بن السائب (٦٥، ٦٦) کاتب کی غلطی سے دو جگہ مرقوم ہے، ان سو حضرات میں سے ممکن ہے کہ ابوعسّال (۱۰۴) کا مولانا سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی حال نہ مل سکا کہ وہ کون ہیں، اس لئے بعض حضرات نے جو ۹۹ تعداد بتلائی ہے، وہی مولانا مرحوم کے نزدیک بھی راجح ہو، وتحقیقہ تحقیق المؤلف۔

﴿ب﴾ مؤلف محترم کی نقل فہرست مطابق اصل نہ ہوسکی، ممکن؛ بلکہ غالب گمان ہے کہ وہ کتابت کی غلطی ہے، مؤلف محقق نے طباعت کے وقت تصحیح کی مکمل نگرانی نہیں فرمائی، ورنہ نمبرات ذیل کے اسمائے گرامی غلط نہ چھپ جاتے اور امام صاحب کے اساتذہ میں سے ایک نام چھوٹ نہ گیا ہوتا، نمبرات مندرجہ ذیل ہیں:

۲، ۱۰، ۴۴، ٦٥، ٦٦، ٦٨، ۷۳، ۸۷، ۸۸، ۹۴، ۹٦۔

ان میں سے (۱۰) پر جس راوی کا حوالہ ہے، اس کی روایت مسند صفحہ ۲۳ پر یوں ہے: "أبو حنيفة، عن علي بن الحسين الزرّاد، عن تمام، إلخ"، "صاحب تنسیق" نے (۵۴) "علی بن الحسین" کو وہم بتا کر "أبو الحسن الزرّاد" قرار دیا ہے، جو مطبوعہ مسند شریف میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور مؤلف محترم کے کاتب نے "الحسن بن الزراد" قرار دے دیا ہے، جو بالیقین غلط ہے۔

مؤلف محقق کی نقل میں چھوٹ جانے والے استاذ (محمد بن عیسیٰ) کے بارے میں "صاحب تنسیق" لکھتے ہیں:

"رَوَى لَهُ الإمَامُ فِيْ الشّفَاعَةِ لأهْلِ الكبَائِرِ وَالعَظَائِمِ وَالدّمَاءِ ...
.........عَنْ أنَسِ بْنِ مَالِكٍ مَرْفُوْعًا" (ص: ۸۱).

مسند امام اعظم کا تقابلی مطالعہ

﴿ج﴾ صحیحین سے تقابلی مطالعہ کی دعوت دے کر مؤلف محترم نے مسند امام اعظم کو جو صحیحین اور موطا کے درجہ میں شمار کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے، اگر اس میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی کہ مسند شریف کے جملہ رواۃ صحیحین یا ان میں سے کسی ایک کے راوی ہیں، تو کسی حد تک مسند کی روایات علی شرط الشیخین قرار پاسکتی تھیں؛ لیکن ایک سو بارہ اساتذہ کرام میں سے صرف اکیاون بزرگوں کو صحیحین یا ان میں سے کسی ایک کا راوی ثابت کر سکے، اساتذہ کے علاوہ بے شمار راویوں کو تو چھیڑا ہی نہیں اور اساتذہ میں سے (٦١) افراد کو علی شرط الشیخین قرار دینے کے لئے ضروری تھا کہ ان پر جو جرحیں ائمہ فن نے کی ہیں، ان کا مدلل جواب لکھا جاتا، جس کی طرف یکسر توجہ نہ کی گئی، "لے دے کر" عبدالکریم بن ابی المخارق کے اوپر جو اعتراض تھا، جس کا جواب نہایت تفصیل سے مولانا اسرائیلی رحمۃ اللہ علیہ نے "تنسیق" میں دیا ہے، اسی کو مختصراً ذکر کر کے نہ یہ کہ صرف اپنے کو سبک دوش سمجھ لیا گیا؛ بلکہ "محوحیرت" ہو کر یہ بلند بانگ دعوی بھی کر بیٹھے کہ

> "مسند امام اعظم بھی اصح الکتب بعد کتاب اللہ تعالی ہے، ہاں! اگر کسی حدیث پر اعتراض ہوسکتا ہے تو اس کے لئے نشانہ بخاری و مسلم کو بننا چاہئے، نہ کہ مسند امام اعظم کو، جب کہ اس میں حضرات صحابہ اور رواۃ کے درمیان صرف ایک دو واسطے ہیں"، (ص:٦٤)۔

اس جگہ موصوف امت محمدیہ کے "تلقي بالقبول" کی اہمیت کو محفوظ نہ رکھ سکے اور نہ ہی اہل فن کا یہ اصول ذہن میں رہا کہ جو کتابیں شاذ و نادر افراد کے ہاتھوں میں رہی ہوں اور وہ جن کو پوری امت نے متواتر قرار دیا ہو، دونوں قسم کی کتابیں ایک حیثیت نہیں رکھتیں، ذرا "أصح السِّيَر" کے مقدمہ کا مطالعہ فرمالیں تو اچھا ہے، اس بحث کو چھوڑ کر ابھی ہم "تقابلی مطالعہ" میں ایک راوی جو بقول مؤلف صحیحین کے راوی ہیں، "أبُو يَعْفُور"، ان کی اس روایت کا جائزہ لیتے ہیں، جن کی روایت مسند امام اعظم

میں تین جگہ ہے:

''وُجُوْبُ الوِتْرِ'' میں ہے: أَبُوْ حَنِيْفَةَ عَنْ أَبِيْ يَعْفُوْرَ العَبْدِيِّ عَمَّنْ حَدَّثَهُ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (الحديث)
اس سند سے ''فِيْ رِوَايَةٍ ، فِيْ رِوَايَةٍ'' کہہ کر چار حدیثیں ہیں، (ص:۸٦)۔

تطبیق کے بیان میں یوں ہے:'' أَبُوْ حَنِيْفَةَ عَنْ أَبِيْ يَعْفُوْرَ عَمَّنْ حَدَّثَهُ عَنْ سَعْدِ بْنِ مَالِكٍ (الحديث) صفحہ:٦١۔

پھر آگے چل کر ''کتاب البیوع''میں یوں ہے:

أَبُوْ حَنِيْفَةَ عَنْ أَبِيْ يَعْفُوْرَ عَمَّنْ حَدَّثَهُ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بَعَثَ عَتَّابَ بْنَ أَسَيْدٍ (الحديث) صفحہ:۱۲۹۔

ان چھ حدیثوں میں ابویعفور کے استاذ مجہول الذات اور مجہول الصفات ہیں، کیا اس بنا پر کہ ان کے راوی ابویعفور بقول مؤلف محترم رجال صحیحین میں سے ہیں، یہ روایتیں اعلی درجہ کی صحیح کہی جا سکتی ہیں؟

اور کیا اس کی کوئی نظیر اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری میں پیش کی جا سکتی ہے؟

اور کیا صحیح مسلم میں بلا متابعت کے مجہول الذات راویوں سے کوئی روایت ہے؟

ترقی کر کے ہم پوچھتے ہیں کہ امام ترمذی جن کی کتاب ''السننُ الجامع'' قوت صحت میں پانچویں درجہ کی ہے اور جو ابویعفور کی روایت کو ''أبوابُ الأطعِمَة'' میں حسن صحیح قرار دے چکے ہیں، کیا ایسی ہی روایتوں کو صحیح قرار دیتے ہیں، جس کے راوی مجہول الذات اور مجہول الصفات ہوں، ایسا ہرگز نہیں ہے؛ بلکہ رَجَاءُ بْنُ حَيْوَةَ عَنْ كَاتِبِ المُغِيْرَةِ (وَرَّاد) عَنْ المُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ کی ''مسح اعلی الخف واسفلہ'' والی روایت کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''معلول'' قرار دے دیا؛ کیوں کہ ثور بن یزید کے بعض تلامذہ ''حُدِّثْتُ عَنْ كَاتِبِ المُغِيْرَةِ'' نقل کرتے ہیں۔

مجاہیل کی روایتوں کو جانے دیجئے، اعلی درجہ کی حسن روایتیں جن کے رواۃ پر صرف تام الضبط نہ ہونے کا کلام ہے، اگر اصح الکتب بعد کتاب اللہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ لاسکتے، تو "جزء القراءة" اور "رفع اليدين" لکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، "تقابلی مطالعہ" ذرا سا آگے بڑھ کر ملاحظہ فرمائیے:

﴿۱﴾ أَبُوْ حَنِيْفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ إِبْرَاهِيْمَ عَمَّنْ لا أَتَّهِمُ عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ .... (مسند شریف ص:۱۶۶)

﴿۲﴾ أَبُوْ حَنِيْفَةَ عَنْ مَعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ...... (سنن نسائی ۲/۱۸۹)

﴿۳﴾ .... أَبُوْ أُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ .... (صحیح مسلم ص:۴۵۳)

﴿٤﴾ عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ نَا سُفْيَانُ ثَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ..... (صحیح بخاری ص:۲۸۷)

اس کے بعد مرفوعاً متن حدیث متقارب اللفظ ہیں، یعنی: لا يُسَاوِمُ الرَّجُلُ عَلٰى سَوْمِ أَخِيْهِ، وَلا يَخْطُبُ عَلٰى خِطْبَةِ أَخِيْهِ. (الحدیث).

اس متن کے ساتھ پہلی حدیث جو مسند امام اعظم میں ہے، اس میں حضرت ابوہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے راوی ایسے مجہول شخص ہیں جو امام صاحب کے نزدیک متہم نہیں ہیں؛ لیکن دوسرے لوگ ان کے متہم یا غیر متہم ہونے کی اطلاع نہیں پاسکتے، (کیوں کہ نام معلوم نہیں کہ تحقیق کرسکیں)۔

اور (۲و۴) نسائی اور بخاری کی روایت میں ان کے راوی فقہائے سبعہ میں سے فقیہ مدینہ، جلیل القدر امام سعید بن المسیب ہیں۔

اور مسلم شریف کی روایت (۲) وہ راوی امام الرؤیا محمد بن سیرین ہیں۔

ان دونوں کی شہرت کے ساتھ ساتھ اگر کوئی ان کی فقاہت، تورع، احتیاط فی الحدیث وغیرہ اوصاف کا پتہ لگانا چاہے تو بے شمار مواد میسر ہیں، کیا پہلی حدیث کسی طرح ان روایتوں کے ہم پلہ ہوسکتی ہے، دراں حالے کہ حدیث (۲) صحیحین سے فروتر کتاب سنن نسائی کی ہے، فقہ میں، ضبط میں، شاگردوں کی کثرت میں، غرض وجوہ ترجیح میں سے کسی درجہ میں "عَمَّن لا أتَّهِم" والی روایت ہمسری کرسکتی ہے؟

اور باوجود اس کے کوئی اسے ان روایتوں سے اونچا درجہ دے کر صرف کتاب اللہ سے کم تر قرار دے، تو "انصاف کا خون ہو رہا ہے" یا انصاف کا بول بالا ہو رہا ہے؟

مسند امام اعظم کے رواۃ مجروحین

اس کے بعد ہم دو چار مثالیں ایسے رُواۃ کی پیش کرتے ہیں، جو ایک دو واسطہ والی اصح الکتاب مسند امام اعظم کے راوی ہیں، صحیحین میں ان کی روایتیں قطعاً نہیں ہیں اور سامنے ان پر کی ہوئی جرحوں کو ذکر کرتے ہیں، جن کے دفع کرنے کی مؤلف محقق نے بالکل کوشش نہیں کی، تاکہ خوب واضح ہوجائے کہ محض اکیاون (۵۱) راویوں کے ضبط واتقان کو دیکھ کر یہ "بلند بانگ" دعویٰ خلاف حقیقت اور غیر محتاط ہے، دعویٰ پیرا نمبر ﴿ج﴾ میں دیکھ لیا جائے۔

رواۃ مجروحین کا نقشہ:

	رواۃ مجروحین مع نمبرات مؤلف	اہل فن کی جرحیں
۱	محمد بن السائب الكلبي (٦٥)	المتهم بالكذب، ورمي بالرفض، وإذا انضم إليه محمد بن مروان السدي الصغير فهي سلسلة الكذب.
۲	محمد بن الزبير الحنظلي (٦٤)	متروك.
۳	ابن لهيعة بالواسطة راوي طريف بن شهاب ٣١ - ١٠١	متفق على ضعفه. قال النسائي: متروك الحديث، أبوداود: ليس بشيءٍ، واهي الحديث، أبوحاتم: ضعيف الحديث، ليس بقوي، ابن معين: ضعيف الحديث، أحمد بن حنبل: ليس بشيءٍ، لا يكتب حديثه، البخاري: ليس بقوي عندهم.
۴	الحارث الأعور بالواسطہ راوی	كذاب، رمي بالرفض، الشعبي: كان كذابًا
۵	محمد بن عبد الرحمن التستری بالواسطہ راوی	مجهول.

کیا ان جرحوں کا جواب دیئے بغیر ان کی روایتوں کو اصح الروایات قرار دینے کا دعوی مسلم ہوسکتا ہے؟

﴿ د ﴾

مؤلف محقق صفحہ ۱۶۵ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس جگہ میں نے امام صاحب کے سو (۱۰۰) سے زائد ان شاگردوں کے اسماء کی فہرست نقل نہیں کی، جن کی احادیث صحاح ستہ میں بھی ہیں اور ''جامع المسانيد'' میں بھی ہیں، جس کا جی چاہے یہ طویل فہرست مقدمہ '' تَنسِيقُ النظام'' میں دیکھ سکتا ہے''۔

تلامذۂ امام کی روایات یقیناً صحاح ستہ میں ہیں، ان میں سے سو (۱۰۰) سے زائد کی فہرست یکجا اگر کہیں مل جائے تو علم حدیث کے طالب علم کے لئے انتہائی خوشی کا مقام ہے؛ اس لئے ہم نے مقدمہ '' تَنسِيقُ النظام'' کی دوبارہ ورق گردانی کی؛ لیکن اپنی کوتاہ نظری سے وہ فہرست نہیں ملی، اگر مؤلف موصوف صفحہ کا حوالہ دے دیتے تو آسانی ہوتی؛ کیوں کہ '' تَنسِيقُ النظام'' کے مطالعہ کا ہمارا حاصل کلام اتنا ہے کہ ''مقدمہ تنسیق'' میں پہلے مسند شریف کے نسخوں کی تفصیل ہے اور اس پر وارد ہونے والی جرحوں کا جواب ہے، پھر مقدمہ میں تین باب ہیں، بابِ اول میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی ہیں اور بابِ دوم میں امام صاحب کی تابعیت کی تحقیق مذکور ہے، اس کے بعد تیسرے باب میں رجال مسند پر وہ تفصیلی کلام ہے، جس کی طرف ہم نے ''الف'' کے پس منظر میں اشارہ کردیا ہے۔

بابِ دوم میں امام صاحب سے حدیث روایت کرنے والوں کے اسمائے گرامی خطیب بغدادی کے حوالہ سے صرف اس قدر ہیں:

(۱) يَحيَى الحِمَّاني (۲) عَبَّادُ بنُ العَوَّام (۳) عَبدُ اللّٰه بنُ المُبَارَک (٤) وَكِيعُ بنُ الجَرَّاح (٥) يَزِيد بنُ هارُون (٦) عَلِي بنُ عاصم (۷) أبُويُوسف القَاضي (۸) محمّد بنُ الحَسن (۹) عَمرُو بنُ مُحمّد العَبْقَري (۱۰) أبُوعَبد الرَّحمٰن المُقْرِي (۱۱) عَبدُ الرَّزَّاق بن الهُمَام.

اور بابِ اول میں مزید یہ چار نام بھی ہیں:

(۱۲) لَیثُ بنُ سَعد (۱۳) مالک بنُ أنس (۱٤) مِسعَر بنُ کِدام (۱٥) زُفَر.

جن میں سے بعض صحیحین کے راوی بھی نہیں ہیں، پچاسی سے زائد رواۃِ صحاح ستہ جو امام صاحب کے تلامذہ ہیں، ان کی فہرست کس جگہ ہے؟ صفحہ کا حوالہ مطلوب ہے۔

﴿ ھـ ﴾

قسم کھانے میں اگر ان شاء اللہ کہہ لیا جائے، تو قسم منعقد نہیں ہوتی، پھر اس کے لئے جمہور ائمہ کے نزدیک متصلاً ان شاء اللہ کہنا ضروری ہے۔

طاؤس اور الحسن انتہائے مجلس تک وسعت دیتے ہیں، سعید بن جبیر چار مہینے تک مہلت کے قائل ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما پوری زندگی ان شاء اللہ کہہ لینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ (نووی شرح مسلم)

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مناظرہ منصور عباسی کی مجلس میں ہوا، کس کے ساتھ ہوا؟ مؤلف موصوف ''الموفق'' کے حوالہ سے امام المغازی محمد بن اسحاق کے ساتھ فرماتے ہیں اور ''محقق ہند'' علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سیرت النعمان'' میں ''ربیع'' حاجبِ منصور کے ساتھ نقل فرمایا ہے، بیان واقعہ میں تمہیداً یہ جملہ انتہائی غیر محتاط ہے کہ:

''ابن اسحاق صاحبِ مغازی؛ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کینہ اور حسد رکھتے تھے''۔ (کتاب مذکور صفحہ ۱۰۳)

خیر القرون کے دو اماموں کا آپس میں کینہ کپٹ اور بغض رکھنا قابلِ اعتماد نہیں معلوم ہوتا، ہاں! امراء وسلاطین اور ان کے خوشامدی لوگوں میں یہ عیب ہو تو انگیز کر لینے کے قابل ہے، اس لئے بیان واقعہ میں کسی روایت کو ترجیح دیتے وقت اس کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ کیسی شخصیت مجروح ہو رہی ہے۔

"وفیاتُ الأعیان" لابن خلکان کے حوالہ سے بعض درسی کتابوں میں بھی یہ مناظرہ "رَبِیع" صاحبِ منصور کے ساتھ ہونا مذکور ہے، اگر یہ تاریخی واقعہ صحیح ہو تو ہمارے نزدیک ربیع کی طرف منسوب کرنا بہتر ہے؛ البتہ کتب رجال میں جو جرحیں مذکور ہیں اس کی بنیاد "حفاظتِ دین" اور نقل حدیث میں شدت احتیاط ہے نہ کہ حسد، بغض اور کینہ، عداوت جیسے اوصاف مذمومہ، (اس کی شہادت ترمذی کی کتاب العلل اور مقدمہ صحیح مسلم وغیرہ ہیں)۔

﴿ و ﴾

کتاب کی ظاہری خوشنمائی کو کتابت کی غلطیوں نے جا بہ جا داغ دار بنا دیا ہے، دوسرے ایڈیشن میں اس کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ ایک جگہ آیت کریمہ بھی غلط چھپ گئی ہے۔

﴿ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَمْوَالَهُمْ وَأَنْفُسَهُمْ ﴾ (ص: ۹۲)

"أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ" صحیح ہے۔

وَاللّٰه أعلَمُ بالصَّوابِ، وهُو المُوَفِّق للسَّدَادِ
وصَلَّى اللّٰه على النَّبيِّ وآله وصَحْبه وسَلَّم

زین العابدین الاعظمی، دارالعلوم چھاپی، گجرات
۲۴؍ربیع الاول ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۲؍فروری ۱۹۸۰ء

باسمہ سبحانہ

فہرست مضامین کتاب ''المرتضی کرم اللہ وجہہ'' وغیرہ کا علمی احتساب

تحقیق حدیث افک

تمت بالخیر